اگست ۲۰۰۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

معیاری نصابی تعلیم، پرسکون باوقار علمی ماحول، دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام

قرآن کالج

آف آرٹس اینڈ سائنس (الحاق شدہ BISE)

191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

فون: 5833637 - 5860024

F.A (Arts Group)
F.A (General Science)
I.C.S (Maths+Stats+Comp.)
I.C.S (Maths+Phys.+Comp.)
I.Com (Banking)
I.Com (Computer)
B.A (Economics + Maths)
B.A (Other Combinations)

انٹرمیڈیٹ کلاسز میں داخلہ فارم جمع کرانے کی آخری تاریخ 31 جولائی ہے

زیر اہتمام

مرکزی انجمن خدام القران لاہور

صدر مؤسس

ڈاکٹر اسرار احمد

موقع پر تشریف لا کر کالج کی عمارت، لائبریری، کمپیوٹر لیب، کالج ہاسٹل اور شاندار ''قرآن آڈیٹوریم'' کا معائنہ بھی کیجئے۔ کالج کا تعارفی بروشر مفت اور پراسپکٹس -/30 روپے میں حاصل کیجئے۔

ذہین و مستحق طلبہ کے لئے وظائف کی خصوصی سہولت

اقتدار احمد ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام ایف اے اور بی اے کی معیاری تعلیم کا جدید ادارہ

طوبیٰ گرلز کالج لاہور (رجسٹرڈ)

ایف اے اور آئی سی ایس میں داخلہ جاری ہے

- اسلامی تعلیمات اور نظریۂ پاکستان کے فروغ پر خصوصی توجہ
- باپردہ اور پاکیزہ ماحول
- خوبصورت اور کشادہ عمارت
- ماڈرن کمپیوٹر لیب اور کمپیوٹر کی لازمی تعلیم بلا اضافی فیس
- طالبات کے لئے ٹرانسپورٹ (Pick & Drop) کی سہولت
- بیرون لاہور کی طالبات کے لئے ہوسٹل کی محدود سہولت

مزید معلومات کے لئے پراسپکٹس حاصل کریں

طوبیٰ گرلز کالج 78 سیکٹر اے ون ٹاؤن شپ لاہور

فون: 5114581 E-mail:toobacollege@hotmail.com

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۵۲

شمارہ: ۸

جمادی الاخریٰ ۱۴۲۴ھ

اگست ۲۰۰۳ء

فی شمارہ ۱۲/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

☆ اندرون ملک 125 روپے

☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 800 روپے

☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36-کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 03-02-5869501

فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67-گڑھی شاہو علامہ اقبال روڈ، لاہور

فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110

ای میل: markaz@tanzeem.org

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

تذکرہ و تبصرہ ______ 3

حافظ عاکف سعید

منتخب نصاب ۔۲ ______ 5

اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف

ڈاکٹر اسرار احمد

تاریخ عالم ______ 28

احیاء العلوم کے بعد کا یورپ اور آج کا اسلام

عبدالحق بیولے

منہاج المسلم (۳۲) ______ 45

- حسنِ خلق
- صبر و تحمل

علامہ ابوبکر جابر الجزائری

دعوت و تحریک ______ 57

امریکی معاشرے میں دعوت و اقامت دین کے کام کی ممکنہ عملی صورت

پس نوشت ..... جولائی ۲۰۰۳ء

ڈاکٹر اسرار احمد

دنیائے اسلام ______ 61

المملكة الهاشمية الاردنية

سید قاسم محمود

❀ ❀ ❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

ایک اسلامی معاشرہ میں نظریۂ توحید کو اساس اور بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی نظام حکومت میں پورا معاشرتی ڈھانچہ اسی محور کے گرد گھومتا ہے۔ اسلام کا سیاسی نظام ہو یا معاشی نظام' سماجی نظام ہو یا معاشرتی نظام' سب اسی نکتۂ توحید کی تفسیریں ہیں' اور اس کے ساتھ منطقی طور پر مربوط ہیں۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق نظریۂ توحید کے بعد اسلامی معاشرہ میں احترام والدین اور ادائیگی حقوق کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے جبکہ مغربی تہذیب اس کے برعکس غلط اور غیر فطری اقدار کی ترویج کے ذریعے فطرتِ انسانی کو مسخ کرنے کے درپے ہے۔ مغربی تہذیب الحاد' مادہ پرستی اور ذاتی مفادات کے حصول جیسے اصولوں سے عبارت ہے' جبکہ اسلامی تہذیب و معاشرت میں افراد میں ادائیگی حقوق کا جذبہ بیدار کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اللہ کا حق سب سے مقدم ہے کہ اس کے ساتھ کسی نوع کا شرک نہ کیا جائے۔ اس کے بعد حقوق العباد کا معاملہ نہایت اہم ہے جس میں والدین کا حق سب سے بڑھ کر ہے۔

اسی طرح معاشی میدان میں اسلامی تعلیمات کا حاصل یہ ہے کہ انسان کے پاس جو بھی مال و دولت ہے وہ اس کا مالک نہیں بلکہ امین ہے اور اس کے حوالے سے اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہے۔ اگر کسی شخص کو اللہ نے اس کی ضرورت سے زائد مال و دولت عطا فرمایا ہے' تو یہ اضافی مال دراصل معاشرے کے محروم طبقات کا حق ہے۔ اسلامی معاشرے کے دولت مند طبقے کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا اضافی مال فضول کاموں اور تبذیر میں لٹانے کی بجائے معاشرے کے نادار طبقات اور اپنے غریب رشتہ داروں کی ضرورتوں کا خیال رکھیں۔ وہ لوگ جو تبذیر کرتے یعنی فضول کاموں اور نام و نمود کے لئے اپنا مال لٹاتے ہیں انہیں قرآن نے شیطان کے بھائی قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تبذیر کے نتیجے میں معاشرے کے غریب اور نادار طبقات میں احساسِ محرومی بڑھ جاتا ہے اور سرمایہ دار طبقہ کے خلاف شدید بغض اور نفرت کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ اس طرح معاشرہ بدترین طبقاتی تقسیم کا شکار ہو جاتا ہے۔ جبکہ مغربی سوچ کے مطابق انسان اپنے افعال میں آزاد ہے' وہ جیسے چاہے مال کمائے' جیسے چاہے اپنا مال خرچ کرے' اور جیسے چاہے اپنی زندگی گزارے۔ اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ مغربی تہذیب اور معاشرت میں انسانی رشتے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ والدین اور اولاد جیسے رشتے بھی مادہ پرستانہ ذہنیت اور ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھ کر اپنا تقدس و احترام کھو بیٹھے ہیں۔ آج کی مادہ پرستانہ سوچ یہ ہے کہ زندگی کو پرلطف اور پرمسرت بنانے میں اگر اولاد رکاوٹ بنتی ہو تو انہیں آیاؤں کے سپرد کر دو اور بوڑھے والدین اگر رکاوٹ بنیں تو انہیں اولڈ ہومز کے حوالے کر دیا جائے۔

دورِ حاضر کی مادر پدر آزاد مغربی تہذیب کے پیچھے دراصل یہود کا شیطانی ذہن کارفرما ہے، جنہوں نے انسانیت سے اپنی دو ہزار سالہ محرومیوں کا بدلہ لینے کے لئے یہ خلافِ فطرت اور شرم و حیا سے عاری تہذیب تشکیل دی ہے تاکہ انسان کو شرفِ انسانیت سے محروم کر کے حیوانِ محض بنا دیا جائے۔ افسوس آج ہم مسلمان بھی اسلامی تعلیمات کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کے دلدادہ ہو چکے ہیں اور ہم نے یورپ و امریکہ کو اپنا معاشرتی قبلہ بنالیا ہے۔ اگر ہم نے اپنی اصل کی طرف رجوع نہ کیا تو ہمیں دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

KHALID TRADERS

IMPORTERS - INDENTORS - STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER - SMALL TO SUPER - LARGE

NATIONAL DISTRIBUTORS NTN BEARINGS

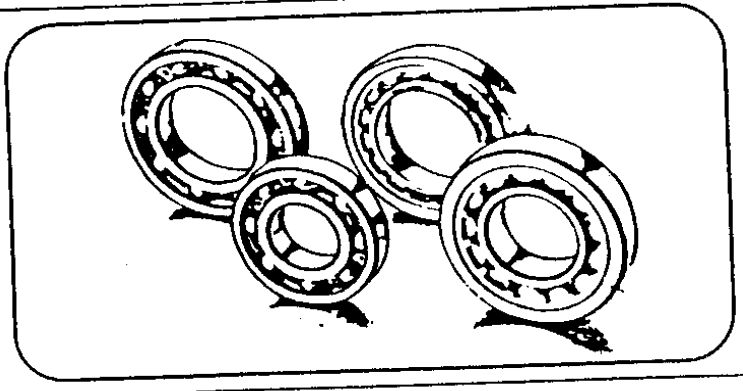

PLEASE CONTACT

Opp. K.M.C. Workshop, Nishtar Road, Karachi-74200, Pakistan.
G.P.O. Box #. 1178 *Phones* : 7732952 - 7730595 *Fax* : 7734776 - 7735883
E-mail : ktntn@poboxes.com

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : ***SIND BEARING AGENCY,*** 64 A-65 Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400(Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : 5 - Shahsawar Market, Rehaman Gali No. 4, 53-Nishtar Road, Lahore-54000, Pakistan. Phones: 7639618,7639718,7639818, Fax: (42) : 763-9918

GUJRANWALA: 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

(اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کے اوصاف اور تنظیمی مسائل کے ضمن میں ہدایات)

درس ۳

اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرنے والوں کے

مطلوبہ اوصاف

(درس نمبر ا کا تتمہ)

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ..... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۞ وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ ۞ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۞ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ ۞ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۞ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ۞ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۞ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۞﴾ (الشوریٰ:۳۶۔۴۳) .... صدق اللہ العظیم

قبل ازیں ہم سورۃ الفتح کی آخری آیت اور سورۃ المائدہ کی آیت ۵۴ کی روشنی میں ''اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف'' کا مطالعہ کر چکے

ہیں۔ اس کے بعد ہم نے دو نشستوں میں ''اقامتِ دین کی فرضیت اور اس کے لئے زوردار دعوت'' کے عنوان سے سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ اور اسی کے تتمہ کے طور پر آیات ۴۷، ۴۸ کا مطالعہ کیا۔ اسی مناسبت سے اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف سورۃ الشوریٰ میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ جن لوگوں کو اقامتِ دین کی فرضیت کا شعور حاصل ہو جائے اور وہ اس کے لئے کمرِ ہمت کس لیں، اس کے لئے ارادہ کر لیں، انہیں یہ جان لینا چاہئے کہ اس جدوجہد کے لئے کچھ مطلوبہ اوصاف ہیں۔ تو گویا کہ وہی مضمون جو اِس سے پہلے سورۃ الفتح کی آخری آیت اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ میں آ چکا ہے، اب یہاں سورۃ الشوریٰ کی آیات ۳۶ تا ۴۳ میں آ رہا ہے۔ یہ مضمون خاصا طویل ہے، لیکن اس نشست میں مَیں اس پر اِختصار سے گفتگو کروں گا۔ ان آیات کا تفصیلی درس مَیں کراچی میں شامِ الہدیٰ کی دو نشستوں میں دے چکا ہوں اور اس کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ موجود ہیں۔ جو حضرات تفصیل اور وضاحت کی ضرورت محسوس کریں وہ ان کیسٹس سے استفادہ کریں۔

اب ہم ان آیات کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾

''جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی (چند روزہ) زندگی کا سروسامان ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہیں۔''

ترجیحِ آخرت

پہلی آیت میں دو اوصاف بیان ہوئے ہیں اور یہ ایمان کا لبّ لباب اور حاصل ہے۔ ہمارے ہاں یہ تشبیہہ اور تمثیل کئی مرتبہ بیان ہو چکی ہے کہ دین کا جو عملی پہلو ہے اس کے لئے ایمان کو جڑ کا درجہ حاصل ہے۔ یہ عملی پہلو چاہے انسان کی انفرادی زندگی اور اس کی ذات سے متعلق ہو، چاہے شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کی جدوجہد ہو،

ان سب کے لئے ظاہر بات ہے کہ اصل شے وہ جڑ ہے جس سے کہ غذا ملتی ہے' جس سے توانائی حاصل ہوتی ہے' اور وہ ایمان ہے۔ لہٰذا یہاں ان اوصاف کے ضمن میں سب سے پہلے ایمان کا لب لباب بیان کر دیا گیا۔ اس ضمن میں پہلی شے یہ فرمائی گئی کہ ﴿فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا کی زندگی کا سروسامان ہے''۔ جو کچھ بھی تم دیئے گئے ہو' کوئی بڑی سے بڑی شے یا چھوٹی سے چھوٹی شے' وہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی کا برتنے کا سامان ہے۔ ''شَيْءٍ'' یہاں نکرہ ہے اور نکرہ عربی زبان میں تفخیم کے لئے بھی آتا ہے' تعظیم کے لئے بھی اور تحقیر کے لئے بھی۔ یعنی کسی چیز کی عظمت کا بیان کرنا ہو' اس کی بڑائی کا بیان مقصود ہو یا اس کا چھوٹا پن ظاہر کرنا ہو تو اسے نکرہ استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو جمع کیا ہے کہ کوئی بڑی سے بڑی شے جو دنیا میں مل جائے' فرعون کی حکومت' نمرود کی حکومت یا قارون کا خزانہ' اور کوئی چھوٹی سے چھوٹی شے یہاں کسی کو ملتی ہے' اس کے بارے میں یہ واضح فرما دیا کہ اوّل تو وہ ''اُوْتِيْتُمْ'' کے حکم میں ہے' وہ تمہاری اپنی کمائی ہوئی نہیں ہوتی' دی گئی ہوتی ہے۔ سورۃ الحدید میں الفاظ آئے ہیں کہ ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ ''اور خرچ کرو ہر اُس چیز میں سے جس کا اس نے تمہیں اختیار بخشا ہے''۔ یہاں بھی صرف اسلوب کے بدلنے سے ایک اہم رہنمائی ہو گئی کہ یہ نہ سمجھنا کہ یہ تمہارا اپنا کسب ہے' تمہاری اپنی کمائی ہے' تمہاری اپنی محنت سے حاصل کردہ شے ہے' تمہاری اپنی صلاحیتوں کا ثمرہ ہے' تمہاری ذہانت کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ سمجھو گے تو تمہارا قدم قارونیت کی طرف اٹھ جائے گا' اس لئے کہ اُس نے یہ کہا تھا کہ یہ دولت و ثروت میرے علم کا حاصل ہے ﴿اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾

دوسری بات یہ واضح کر دی گئی کہ یہ ''مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' ہے' یہ بس اس چند روزہ دنیا کی زندگی کا برتنے کا سامان ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ نے تمہیں یہاں امتحان کی خاطر کچھ عرصے کے لئے ٹھہرائے رکھنا ہے' جو تیس چالیس سال بھی ہو سکتا ہے' پچاس ساٹھ سال بھی اور دس بیس سال بھی۔ یہ تمہارا امتحانی عرصہ ہے۔ تو اگر کمرۂ

امتحان میں تمہیں ایک کرسی اور میز دے دی گئی' کوئی قلم دے دیا گیا اور وہاں تمہارے لئے پانی کا کوئی اہتمام کر دیا گیا کہ کوئی ملازم کھڑا ہے' تو کیا ان چیزوں کے بارے میں تمہارا یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ تمہاری ملکیت ہیں؟ ان سے تمہیں کوئی قلبی لگاؤ ہوتا ہے؟ بلکہ ساری توجہ کا ارتکاز تو امتحان پر ہوتا ہے۔ تو بس یوں سمجھو کہ یہ امتحانی وقفہ گزارنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمہیں کچھ سامان دے دیا ہے۔ اگر اس سے زیادہ اس کے لئے دل میں کوئی وقعت پیدا ہو گئی اور اس سے زیادہ کوئی تعلق خاطر قائم ہو گیا تو پھر اور جو چاہو کرو' اُس (اقامت دین کی) وادی میں قدم نہ رکھنا ع جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں! نقطۂ نظر کا اگر یہ فرق واقع نہیں ہوا ہے تو اس راستے پر نہیں چل پاؤ گے۔ سوچ سمجھ کر اس وادی میں قدم رکھو ؎

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

دلوں کو ٹٹول لو کہ اس راہ کے مسافر کا وصفِ لازم یہ ہے کہ بڑی سے بڑی شے اور چھوٹی سے چھوٹی شے جو کچھ ملی ہے' یہ صرف اس دنیا کی عارضی زندگی کے برتنے کا ایک سامان ہے۔ اس سے زیادہ اس کی وقعت' اس سے زیادہ اُس کی قدر و قیمت' اس سے زیادہ اس سے کوئی تعلق خاطر اور اس سے بڑھ کر اس کے ساتھ کوئی قلبی لگاؤ اگر ہے تو گویا کہ آدمی پہلے ہی امتحان میں ناکام ہے ؎

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے' نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے!

پھر تو انسان اس شعر کا مصداق بنا رہے گا کہ چلنا چاہتا ہے' چل نہیں پاتا۔ دل میں آگے بڑھنے کی آرزو ہے' خواہش ہے' لیکن پاؤں میں کوئی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس راستے پر چلنا ہے تو اس مخمصے سے آزاد ہو کر آؤ۔

آگے فرمایا: ﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾ ''اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی' اُن لوگوں کے لئے جو

ایمان لائے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔'' ایک لفظ میں اس وصف کو ''ترجیح آخرت'' کا عنوان دیا جا سکتا ہے کہ مطلوب آخرت رہے' دنیا نہ رہے۔ قدر و قیمت آخرت کی نعمتوں کی ہو' دنیا کے ساز و سامان کی نہ ہو۔ یہ ہے اس راستے کی شرطِ اوّل۔

توکّل علی اللہ

ایمان کا دوسرا نتیجہ وثمرہ اور لُبِّ لباب ''توکل علی اللہ'' قرار دیا گیا کہ ﴿وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ﴾ ''اور وہ اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں''۔ چنانچہ توکل صرف اللہ پر ہو' توکل ساز و سامان اور اسباب و وسائل و ذرائع پر نہ ہو' توکل اپنے زور بازو پر نہ ہو' توکل اپنی ذہانت و فطانت پر نہ ہو۔ یعنی پہلی شرط تو یہ کہ دنیا کی عظمت سے دل کو خالی کر کے آؤ۔ اور دوسرے یہ کہ اس راہ میں جو کچھ تمہیں کرنا ہے اس کے لئے بھی بھروسہ اگر اپنے زورِ بازو پر اور اپنی ذہانت و فطانت پر ہے تو پھر بھی ناکام ہو جاؤ گے۔ توکل کلیتًا اللہ کی تائید و نصرت پر' اللہ کی توفیق پر اور اللہ کی مدد پر ہو۔ ہمارا کام محنت کرنا' مشقت جھیلنا' ایثار کرنا' قربانیاں دینا ہے۔ اگر ہم یہ کر گزریں تو ہم تو سرخرو ہو جائیں گے۔ ہو گا وہی جو وہ چاہے گا' اور اُس وقت ہو گا جب اس کو منظور ہو گا۔ یہ فیصلہ ہماری خواہش کے مطابق نہیں ہو گا۔ ہم تو چاہیں گے کہ فوراً لپک کر منزل پر جا پہنچیں ع منزل کی طرف دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے! ہر شخص یہی چاہے گا۔ کون چاہے گا کہ میں چلتا چلا جاؤں' چلتا چلا جاؤں اور منزل پھر بھی نگاہ کے سامنے نہ آئے۔ لیکن اس کے لئے بھی تیار رہو کہ اگر اللہ کو ابھی یہ مطلوب نہیں ہے تو پھر ہمیں بھی وہی چیز پسند ہے جو اسے پسند ہے۔ یہ راضی برضائے ربّ کا مقام ہے۔

یوں سمجھ لیجئے کہ اس ایک آیت کے اندر سورۃ التغابن کے مضامین کا خلاصہ موجود ہے۔ دل اس پر جما ہوا ہو کہ ہار اور جیت کے فیصلے کا دن تو وہ ہے ﴿ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ جو اُس دن ہارا' وہ ہارا اور جو جیتا' وہ جیتا۔ یہاں کسی کو کیا ملا؟ فرض کیجئے کہ کل صبح کسی کو پھانسی ہونی ہے اور آج آپ اسے مخملیں گدے پر سلا دیں تو اس کے لئے وہ مخملیں گدا چہ معنی دارد؟ اسے پتہ ہے کہ صبح اسے پھانسی ہونی ہے۔ اس اعتبار سے

یہاں کے ساز و سامان اور یہاں کے مال و متاع کی کوئی وقعت دل میں نہ رہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ انہیں استعمال نہ کرو۔ یہ بالکل دوسری بات ہے۔ اللہ نے دنیا میں جو کچھ دیا ہے استعمال کے لئے ہی دیا ہے' لہٰذا اللہ کی دی ہوئی چیزوں کو دل کھول کر برتو۔ اگر اللہ دولت دیتا ہے تو اسے استعمال کرو' لیکن دولت کو اپنے دل میں مت داخل ہونے دو۔ اس دولت کو بھی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ بناؤ' اسے اِنفاق فی سبیل اللہ اور ادائے حقوق میں صرف کر دو۔ فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (الاعراف:۳۲) ''(اے نبیؐ! ان سے) کہئے کہ کس نے حرام کر دیا ہے اللہ کی اُس زینت کو جسے اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کس نے اس کی بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں ممنوع کر دیں؟'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ((لَيْسَتِ الزَّهَادَةُ فِى الدُّنْيَا بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ ' وَلٰكِنِ الزُّهْدَ اَنْ تَكُوْنَ بِمَا فِىْ يَدِ اللّٰهِ تَعَالٰى اَوْثَقَ مِنْكَ بِمَا فِىْ يَدَيْكَ))(رواہ الترمذی' بروایۃ ابی ذر الغفاری ؓ)
>
> ''دنیا میں زہد (اپنے اوپر) حلال کو حرام کر لینے اور مال و دولت کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے' بلکہ زہد تو یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس پر تمہارا توکل اور اعتماد زیادہ ہو جائے اُس چیز سے جو تمہارے اپنے ہاتھوں میں ہے''۔

یعنی اپنی ذہانت' اپنی فطانت' اپنے وسائل اور اپنے ذرائع پر اعتماد نہ رہے' بلکہ اعتماد اور توکل اللہ پر ہو۔ اور سورۃ التغابن کی وہ آیت بھی ذہن میں رکھئے: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞﴾ ''اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں' اور اللہ پر ہی اہل ایمان کو توکل کرنا چاہئے''۔ اہل ایمان کا توکل ذاتِ باری تعالیٰ پر مرتکز ہو جانا چاہئے۔

تو اس ایک آیت میں دو اوصاف آ گئے: (۱) ترجیح آخرت (۲) توکّل علی اللہ۔ اصل میں یہ ایمان کے دو نتائج یا دو ثمرات ہیں' اور یہ اس راستے کے اولین

pre-requisites ہیں۔ انسان کی شخصیت میں اور اس کی سوچ اور نقطۂ نظر میں ایمان کے نتیجے میں جو تبدیلی اور انقلاب پیدا ہونا چاہئے یہاں ان کا حوالہ دے دیا گیا ہے کہ انسان کو اس وادی میں قدم رکھنے سے پہلے دیکھ لینا چاہئے کہ اس کے دامن میں ان دونوں چیزوں کی پونجی موجود ہے یا نہیں۔

اگلی آیت میں پھر دو اوصاف بیان ہوئے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝﴾

''اور وہ لوگ کہ جو پرہیز کرتے ہیں بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں''۔

کبائر اور فواحش سے اجتناب

''جنب'' پہلو کو کہتے ہیں اور اجتناب کا مفہوم ہے پہلو بچائے رکھنا' پہلو تہی کرنا' کسی چیز سے بچ کر چلنا۔ ''اجتناب'' ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ لوگ جو اجتناب کرتے ہیں' جو بچتے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو بچائے رکھتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے۔ یہ جو لفظ ''کبائر'' یہاں آیا ہے یہ مضمون قرآن مجید میں دو اور مقامات پر' سورۃ النجم اور سورۃ النساء میں بھی آیا ہے۔ اس سے اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس وصف (کبائر سے اجتناب) کی اہمیت یہ ہے کہ انسان پر جیسے کچھ بہت سے دوسرے جذبات کا غلبہ ہو جاتا ہے ایسے ہی نیکی کا بھی جب آدمی پر ایک غلبہ ہوتا ہے تو اس کی باریک بینیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں' اس کی حس زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک برائی سے آپ نے اپنے آپ کو بچایا تو اب اس سے چھوٹی برائی نظر آئے گی۔ اس کو میں نے کئی مرتبہ بیان کیا ہے کہ یہ بالکل ایسے ہے جیسے پیاز کا ایک چھلکا اتاریئے تو پھر آگے دوسرا چھلکا ہے۔ اس دوسرے چھلکے پر جو داغ ہے وہ آپ کو نظر نہیں آئے گا جب تک آپ پہلا چھلکا نہیں اتاریں گے۔ اس سے پہلے آپ کو اس کا احساس ہی نہیں ہوگا

کہ میرے اندر یہ خرابی بھی ہے۔ جب پہلا چھلکا اترے گا' پہلی خرابی سے آپ اپنے آپ کو بچالیں گے' اپنا دامن پاک کرلیں گے تو دوسرا چھلکا نظر آئے گا۔ دوسرا چھلکا اتاریں گے تو آگے ایک تیسرا چھلکا ہے۔ پھر اس کا کوئی داغ ہے جو نظر آئے گا۔ جب تک دوسرا چھلکا نہیں ہٹے گا' وہ نظر نہیں آئے گا۔ تو یہ ایک فطری تدریج ہے' لیکن اس میں بھی انسان سے ایک غلو ہو جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اصلاحِ ذات میں اگر غلو ہو جائے گا تو وہ اقامتِ دین کی راہ کی رکاوٹ بن جائے گا۔ اگر آپ کی ساری توجہ اپنی انفرادی اصلاح پر مرتکز ہو کر رہ جائے اور آپ اپنے نفس ہی کو مانجھنے اور رگڑنے میں لگے رہیں تو پھر معاشرے کی اصلاح اور اللہ کے دین کے غلبہ کی طرف آپ کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔ ہمارے ہاں رہبانیت کی طرز پر خانقاہیت کا جو ایک انسٹی ٹیوشن بن گیا ہے اس میں ساری توجہ انفرادی اصلاح پر ہے کہ اب اسی میں لگے رہو۔ بعض صوفیاء کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ چالیس سال تک یہ ریاضت کرتے رہے۔ خدا کے بندو! چالیس برس کی ریاضت کے بعد کون سا وقت آدمی کے پاس رہ گیا کہ وہ اس ماحول کی اصلاح کے لئے بھی نکلے' اور اس کے لئے بھی اپنی توانائیاں کھپائے' اس ماحول کے اندر کوئی تبدیلی لانے کے لئے باطل کو للکارے اور نیکی کی قوتوں کو منظم کر کے باطل کے ساتھ ٹکرادے؟

انفرادی اصلاح اور معاشرے کی اصلاح' یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ چلنے چاہئیں اور ان میں عدم توازن نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بھی نہ ہو کہ آدمی اپنے آپ کو بھولا رہے اور دوسروں کی اصلاح کے لئے کوشاں رہے۔ یہ ایک انتہا ہے' جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ:۴۴) ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو' درآں حالیکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟'' اور دوسری انتہا یہ ہے کہ اپنی انفرادی اصلاح میں غلو سے کام لیا جائے اور اجتماعی اصلاح سے اغماض برتا جائے۔ اب آپ غور کیجئے' اسی شہر لاہور میں ایک

صاحب موجود ہیں' انتہائی نیک آدمی ہیں' وہ گوشت اس لئے نہیں کھاتے کہ کچھ پتہ نہیں کہ صحیح ذبح ہوا یا نہیں ہوا۔ پھل اس لئے نہیں کھاتے کہ آج کل باغات کا جو ٹھیکہ ہوتا ہے وہ صحیح طریقے پر نہیں ہوتا۔ اس طرح انہوں نے نامعلوم کیا کیا چیزیں اپنی خوراک میں سے خارج کی ہوئی ہیں۔ تو انفرادی زہد کا تو یہ عالم ہے' لیکن اس ماحول میں رہ رہے ہیں جس میں باطل کا غلبہ ہے اور اس کے ازالے کے لئے کسی اجتماعی جدوجہد کی ان کے اندر کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ عدم توازن کہ ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ فلاں صاحب اتنے زاہد' اتنے عابد اور اتنے متقی ہیں کہ ان کا گھوڑا بھی مشکوک گھاس نہیں کھاتا۔ ٹھیک ہے! اللہ تعالیٰ وہ مقام اگر کسی کو دے دے تو کیا کہنے ہیں۔ لیکن یہ کہ باطل کا غلبہ ہو' غیر اسلامی حکومت ہو' اور اس کی وہ تھانے داری فرما رہے ہوں تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ یہ ہے عدم توازن' کہ ذاتی زہد اور ذاتی تقویٰ کا غلو تو اس حد کو پہنچا ہوا ہے' لیکن باطل سے نبرد آزمائی اور حق کے غلبے کے لئے جدوجہد سرے سے خارج از بحث ہے۔ یہاں اس عدمِ توازن کو روکنا مقصود ہے جس کا ذکر ایک حدیث نبویؐ میں بایں الفاظ کیا گیا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَئِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا. قَالَ فَقَالَ: یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ. قَالَ فَقَالَ : اِقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ ' فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ!))

(امام بیہقی بحوالہ خطبات الاحکام تالیف مولانا اشرف علی تھانویؒ)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت الٹ دو''۔ حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا: ''اے اللہ! اس بستی میں تو تیرا وہ بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی۔'' آپؐ نے فرمایا کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''الٹ دو اس کو پہلے اُس پر' پھر دوسروں پر' اس لئے کہ اس کے چہرے کا رنگ کبھی تھوڑی دیر کے لئے بھی میری غیرت اور حمیت میں متغیر نہیں ہوا''۔

ذرا اس شخص کی ذاتی نیکی کا اندازہ لگائیے کہ اپنے نفس کو مانجھ مانجھ کر اس انتہا کو پہنچ گیا کہ حضرت جبرئیلؑ اللہ تعالیٰ کے حضور گواہی دے رہے ہیں کہ اس نے کبھی ایک لمحہ بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کیا' لیکن اس کی بے غیرتی اور بے حمیتی بھی ملاحظہ کیجئے کہ اسے اس سے کوئی غرض ہی نہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے' کفر کس طرح دندنا رہا ہے' شیطنت کس طرح ننگا ناچ ناچ رہی ہے' بے حیائی کا سیلاب کس طور سے آ رہا ہے' اللہ کی شریعت کا استہزاء کس طرح ہو رہا ہے!

تو یہ جو عدم توازن ہے اس کو قرآنِ حکیم کے ان الفاظ کی روشنی میں دیکھئے: ﴿كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ﴾ یعنی بڑے بڑے گناہوں سے اپنے آپ کو بچا لیجئے' ان سے اپنا دامن پاک کر لیجئے اور بے حیائی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچا لیجئے۔ اس کے بعد میدانِ عمل میں قدم رکھئے' اس جدوجہد میں پڑیئے' تو مزید اصلاح ہو گی۔ لیکن اگر ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ اپنی اصلاح کے عمل کو کامل کر کے ہم اس جدوجہد میں قدم رکھیں گے تو وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔ آدمی کامل تو کبھی ہو گا ہی نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں کامل ہو گیا؟ جو یہ دعویٰ کرے وہ احمق ہے۔ اصلاح تو زندگی بھر کے لئے ایک مسلسل عمل ہے۔

حالتِ غُصّہ میں عفو و درگزر

اس سلسلے کا چوتھا وصف یہ بیان ہوا: ﴿وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝﴾ ''اور جب انہیں غصہ آ جائے تو معاف کر دیتے ہیں''۔ اس آیت میں بیان کردہ یہ دوسرا وصف ہوا کہ انسان غصے میں آ کر کوئی قدم نہ اٹھائے' جھنجھلاہٹ میں آ کر زبان سے کوئی کلمہ نہ نکالے۔ آپ آیت کے الفاظ پر غور کیجئے کہ یہاں غصے کی نفی نہیں ہے۔ سرے سے غصہ نہ آنا تو غیرت وحمیت کے فقدان کی علامت ہے۔ جس شخص کو غصہ آتا ہی نہیں وہ یا تو وہی شخص ہو گا جس میں غیرت وحمیت نہیں' یا پھر پرلے درجے کا کوئی منافق ہو گا۔ جو لوگ بہت زیادہ ٹھنڈے مزاج کے ہوتے ہیں وہ بڑے خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ نے انسان کے اندر غیرت وحمیت کا مادہ رکھا ہے جس کا اظہار غم وغصہ کی صورت میں ہوتا ہے' لہٰذا غصہ آنا چاہئے' البتہ ٹھیک جگہ پر آنا چاہئے' غلط جگہ پر نہیں

آنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اگر شہوت کا جذبہ رکھا ہے تو وہ کوئی بری شے نہیں ہے' ہاں اس کو صحیح رخ پر استعمال ہونا چاہئے' غلط راستہ پر نہیں پڑنا چاہئے۔ اسی طرح غصہ جو ہے اس کی نفی نہیں ہے' لیکن یہ کہ غصے میں کوئی اقدام کیا جائے گا تو غلط ہو جائے گا۔ انسان جو بھی اقدام کرے وہ غصہ رفع ہونے کے بعد کرے' اور اگر غصے کی حالت میں ہو تو معاف کرے۔

سورۂ آل عمران میں اہل تقویٰ کی صفات کے ضمن میں فرمایا: ﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ ''غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے''۔ یہ چیز خاص طور پر کسی اجتماعی جدوجہد میں بہت ضروری ہے۔ اگر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگے' غصے میں آدمی کچھ کہہ دے' غصے میں کوئی قدم اٹھا لے تو یہ بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ میں نے آپ کو خلیل جبران کا فقرہ سنایا تھا کہ ''عقل سے رہنمائی حاصل کرو اور جذبے کے تحت حرکت کرو''۔ منزل کا تعین کہ جانا کہاں ہے' عقل سے ہوگا' ایسا فیصلہ جذبات میں کیا گیا تو غلط ہو جائے گا' البتہ جب طے کر لیا کہ ادھر جانا ہے تو اب عقل کو ایک طرف رکھ دو' چلنے میں یہ رکاوٹ بنے گی' قدم قدم پر مصلحتیں بجھائے گی' قدم قدم پر خطروں سے باخبر کرے گی تو چل نہیں پاؤ گے۔ جب آپ نے منزل کا تعین کر لیا تو عقل کا کام مکمل ہو گیا' اب اسے ایک طرف رکھو اور جذبے کے تحت حرکت کرو۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

اسی طرح غصے میں فیصلہ مت کرو' غصے میں اقدام مت کرو۔ غصہ آئے تو اسے پینے کی کوشش کرو اور ایسے میں مغفرت اور عفو کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرو۔

آگے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾

''اور جنہوں نے اپنے ربّ کی پکار پر لبیک کہی اور نماز قائم کی' اور وہ اپنے معاملات باہم مشورے سے چلاتے ہیں' اور ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

اللہ کی پکار پر لبیک کہنا

یہاں استجابت کا لفظ آیا ہے جو ہم گزشتہ درس میں پڑھ چکے ہیں: ﴿اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ﴾ اور یہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ وہ پکار کون سی ہے۔ اس سے مراد ہے: ﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ؕ﴾ ''دین کو قائم کرو اور دین کے باب میں (اور اقامت دین کی جدوجہد میں) متفرق نہ ہو جاؤ''۔ یہاں دو آیتوں میں چار اوصاف اس سے پہلے بیان کر کے پانچواں وصف یہ فرمایا کہ ''وہ اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں۔ ان اوصاف کے درمیان صحیح ربط یہ قائم ہوا کہ یہ چار pre-requisites ہیں' جو شخص چار کام کر لے وہ اس وادی میں قدم رکھے۔ اگر مال و دولتِ دنیا کی وقعت اور محبت ابھی دل میں ہے اور آپ اقامتِ دین کے اس راستے میں پڑ گئے تو خود آپ کی اپنی شخصیت اور کام دونوں کو نقصان پہنچے گا۔ اس لئے کہ یہی شے درحقیقت منافقت کے لئے تمہید بنتی ہے۔ اگر اللہ پر توکل نہیں ہے تو بھی وہ کام کسی غلط رخ پر پڑ جائے گا۔

اسی طرح اگر اپنے آپ کو ابھی بڑی بڑی خرابیوں سے بھی نجات نہیں دلائی ہے اور ضبطِ نفس ابھی اتنا نہیں ہوا کہ غصے کو قابو میں رکھ سکو تو بھی آپ غلط سٹارٹ لے رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ حدیث آپ کو معلوم ہے جس میں حضور ﷺ نے منافق کے چار اوصاف بیان کئے کہ جس میں یہ چاروں موجود ہیں' وہ پکا اور کٹر منافق ہے' اور جس میں ان میں سے ایک وصف موجود ہے اس میں اسی نسبت سے نفاق موجود ہے۔ اس حدیث میں چوتھا وصف یہ بیان ہوا: ((وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) کہ جب وہ کسی سے جھگڑتا ہے تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے' پھٹ پڑتا ہے' گالم گلوچ پر اتر آتا ہے۔ اسے اپنے اوپر کنٹرول ہی نہیں رہتا' غصے میں اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو منہ میں آیا' بک دیا اور جو اینٹ روڑا ہاتھ میں آیا' دے مارا۔ تو یہ درحقیقت نفاق کی ایک علامت ہے۔

چنانچہ غصے کی حالت میں ضبطِ نفس کی تلقین فرمائی گئی۔ یہ چار اوصاف بیان فرما دیئے گئے کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لئے میدان میں آنے سے پہلے آدمی یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کر لے۔ یہ گویا pre-requisites کے درجے میں ہیں۔ اسی لئے یہاں پر اب پانچواں وصف یہ بیان فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ﴾ ''وہ لوگ کہ جو اپنے رب کی پکار پر لبیک کہیں''۔ جو اپنے رب کی دعوت قبول کریں۔

ہم استقامت اور اقامت کے فرق پر بحث کر چکے ہیں۔ اقامت کا ایک شاذ مفہوم وہ ہے کہ جو استقامت کا اصل مفہوم ہے لہٰذا کہیں کہیں استقامت کی جگہ لفظ اقامت بھی استعمال ہو جاتا ہے' لیکن اقامت کا اپنی جگہ پر اصل مفہوم کسی شے کو قائم کرنا ہے۔ اسی طرح کے یہ دو الفاظ اجابت اور استجابت ہیں۔ اجابت بھی کسی کی دعا یا کسی کی پکار کو قبول کرنے اور کسی کی ندا پر لبیک کہنے کے معنوں میں استعمال ہو جاتا ہے' لیکن اس کے لئے اصل لفظ استجابت ہے۔ لفظ ''اجابت'' کے مختلف صیغے قرآن مجید میں آٹھ جگہ استعمال ہوئے ہیں' جبکہ لفظ ''استجابت'' کے صیغے قرآن حکیم میں اٹھائیس مقامات پر آئے ہیں۔ اور اس سورۂ مبارکہ میں تو تین مرتبہ استجابت کا لفظ آیا ہے۔ سب سے پہلے آیت ۱۶ میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُحَاجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ﴾

اس کے بعد آیت زیر مطالعہ میں لفظ ''اِسْتَجَابُوْا'' آیا — اور پھر سورۃ کے آخری حصے میں آیت ۴۷ میں ''اسْتَجِيْبُوْا'' کا لفظ آیا۔ بہرحال' اب یہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو لبیک کہیں اپنے ربّ کی پکار پر''۔

اقامتِ صلوٰۃ

﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کریں۔'' وہ اپنی اس جدوجہد کے لئے جو اجتماعی ہیئت قائم کریں اس کا اہم ترین وصف اقامتِ صلوٰۃ ہوگا۔ اقامتِ صلوٰۃ کو اس اجتماعیت میں مرکزہ (nucleus) کی حیثیت حاصل ہوگی' جس طرح کہ چکی کے

درمیان وہ کلی ہوتی ہے جس پر وہ گھومتی ہے۔

سورۃ الفتح کی آخری آیت میں ہم یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ''تم انہیں دیکھو گے تو رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے''۔ اپنے انفرادی معاملے کے اعتبار سے وہ نماز نفل ہے' تہجد ہے' قیام اللیل ہے یعنی انفرادی اعمال میں تو تقرب بالنوافل کی اہمیت زیادہ ہے۔ لیکن اجتماعیت کے اعتبار سے اصل اہمیت تقرب بالفرائض کی ہے' چنانچہ یہاں اصل شے فرض نماز ہے۔ لہٰذا یہاں فرمایا: ﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ ''وہ نماز کو قائم رکھتے ہیں''۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پورا پروگرام' ان کے معمولات' ان کے چوبیس گھنٹے کے مشاغل اس نظامِ صلوٰۃ کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں' ان کی پوری زندگی میں نماز کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔

شورائیت کا نظام

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ ''اور ان کا معاملہ باہم مشورے کے ساتھ چلتا ہے''۔ اب چونکہ اجتماعی معاملات کا ذکر آ گیا تو مشورے کی اہمیت بھی واضح کر دی گئی۔ لیکن یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ شورائیت اور جمہوریت دو مختلف چیزیں ہیں۔ ایک تو ان میں بنیادی طور پر فرق ہے کہ جمہوریت اصل میں حاکمیت کے تصور کے ساتھ ہوتی ہے' جبکہ شورائیت میں وہ حاکمیت کا تصور بالکل نہیں۔ عوامی جمہوریت کا موجودہ تصور عوامی حاکمیت کا ہے' یعنی حاکمیت میں تمام عوام شریک ہیں' جبکہ شورائیت جو ہے وہ باہم مشاورت ہے۔ اس شورائیت کے بھی دو مختلف shades ہیں جن کا تعلق مختلف حالات سے ہے۔ ایک حکومت کی سطح پر شورائیت ہے اور ایک کسی جماعت یا تحریک کی سطح پر شورائیت ہے' اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے اس کی ایک Territorial Jurisdiction ہوتی ہے' یعنی ایک علاقہ ہے جس پر حکومت قائم ہے اور اس میں جو کوئی بھی ہے وہ اس حکومت میں شامل ہے' شریک ہے اور ان کی حیثیت مساوی ہے' جبکہ جماعت میں کوئی علاقائی تسلط نہیں ہوتا' اس میں جو

داخل ہوتا ہے اپنی مرضی سے اور جو اس سے نکلتا ہے اپنی مرضی سے۔ دوسرے یہ کہ اقامت دین کی جدوجہد کے لئے جو جماعت قائم ہوتی ہے وہ اس طرح ہوتی ہے کہ ایک داعی ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ '' کی پکار لگاتا ہے اور کچھ لوگ اس پکار پر لبیک کہہ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہاں ایک فرقِ مراتب بھی ہے' جو ریاست میں نہیں ہوتا' وہاں سب شہری برابر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان دو فرقوں کی وجہ سے جماعت اور تحریک کی سطح پر شورائیت اور حکومت کی سطح پر شورائیت کے تقاضے مختلف ہیں۔

اگرچہ خلافتِ راشدہ کے بارے میں جو بھی میرا مطالعہ ہے اس کی بنیاد پر میں پورے انشراح صدر سے کہہ رہا ہوں کہ خلفائے راشدین کے ہاتھ میں ویٹو تھا' خلافتِ راشدہ میں آپ کو کہیں ووٹوں کی گنتی کا ذکر نہیں ملے گا' لیکن اب اگر کوئی اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے تو اس کا جو بھی دستور بنے گا اس میں سربراہِ ریاست کے ہاتھ میں ویٹو کا ہونا ضروری نہیں ہے' بلکہ انتخاب کے ذریعے سے جو بھی ایک ادارہ وہاں وجود میں آ جائے اس میں counting of votes سے فیصلے ہوں' اور کسی کے ہاتھ میں اختیارِ خصوصی نہ دیا جائے تو ''اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ '' کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن جماعت اس نہج سے نہیں چل سکتی۔ وہاں حکومت کے پاس ڈنڈا بھی ہوتا ہے' یہاں جماعت کے اندر کوئی ڈنڈا نہیں ہوتا۔ وہاں ان کے پاس نظم کو قائم رکھنے کے لئے کئی طرح کے معاون ادارے ہوتے ہیں' یہاں کوئی اور چیز نہیں ہے سوائے اس کے کہ ایک اتفاق رائے ہے' لوگوں کی آزادانہ مرضی ہے' ساتھ دینا چاہیں تو دیں' نہ دینا چاہیں نہ دیں' کوئی جبر نہیں۔ لہٰذا جماعت کے معاملے کو حکومت و ریاست پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ یہ ایکسر سائز وہ لوگ کرتے ہیں جنہوں نے اس وادی میں قدم رکھنا ہی نہیں' آگے بڑھنا ہی نہیں' کام کرنا ہی نہیں۔ وہ تھیوری اور نظریئے کے اعتبار سے جو چاہیں' بحث کر لیں۔

جماعتی سطح پر شورائیت کا تقاضا یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں مشورے کی روح جاری و ساری رہے' یہ احساس نہ ہو کہ یہاں پر کوئی تحکمانہ انداز (Authoritarianism)

ہے بلکہ مشورہ ضرور کیا جائے' لیکن پھر مشورے کے بعد فیصلہ ووٹوں کی گنتی سے نہ ہو بلکہ جو صاحبِ امر ہے' جس پر اعتماد کر کے آپ نے اس کی رفاقت قبول کی ہے' اب فیصلہ آپ اُس پر چھوڑ دیں۔ یہ بات میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ سے اخذ کرتا ہوں' جہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ یعنی آپؐ ان سے معاملے میں مشورہ ضرور کیا کیجئے' پھر جو فیصلہ آپؐ کر لیں اس پر ڈٹ جائیے اور اللہ پر توکل کیجئے۔ دیکھ لیجئے یہاں ''عَزَمْتَ'' ہے ''عَزَمْتُمْ'' نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ فیصلہ counting of votes سے ہوگا' تعداد کی بنیاد پر ہوگا' بلکہ مشورہ امیر کی ضرورت ہے' لہٰذا وہ اپنے ساتھیوں کو مشورہ میں شریک کرے گا' لیکن حتمی فیصلے کا اختیار امیر کو ہوگا۔ پس ایک اسلامی جماعت اور تحریک کا نظم یہی ہو سکتا ہے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

انفاق فی سبیل اللہ

﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝﴾ ''اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں'' کھپاتے ہیں' لگاتے ہیں' صرف کرتے ہیں۔ اس میں وہ سب کچھ لے آئیے جس کے بارے میں فرمایا گیا: ''فَمَا أُوتِيتُم'' اور جو سورۃ الحدید میں فرمایا: ﴿وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ﴾ ''اور اس میں سے خرچ کرو جس چیز میں بھی اس نے تمہیں خلافت عطا فرمائی''۔ تمہاری ذہانت بھی اللہ کا ایک عطیہ ہے جو اس نے تمہیں دیا' تمہاری قوتِ کار اور تمہاری توانائیاں بھی اللہ کی عطا کردہ ہیں۔ جو مال و اسباب تمہارے پاس ہے یہ اسی کا دیا ہوا ہے' اس کا عطیہ ہے' اولاد ہے تو اسی کی دی ہوئی ہے' اس کا عطیہ ہے۔ ان سب کو لگاؤ اور کھپاؤ اللہ کی راہ میں۔ اس کے بغیر تو ظاہر بات ہے قدم آگے کیسے بڑھے گا! یہ ساری چیزیں تو محفوظ رہیں' انہیں انسان بچا بچا کے رکھے اور خواہش کرتا رہے کہ کوئی دین کا کام بھی ہو جائے' تو کیسے ہو جائے گا!

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

بدلہ اور قصاص یا عفو و درگزر؟

مطلوبہ اوصاف کے ضمن میں متذکرہ بالا تین آیات بہت اہم اور بہت بنیادی ہیں' اور ان میں سے ایک ایک میں کئی کئی چیزیں آ گئی ہیں۔ اب اس کے بعد جو آیات آ رہی ہیں' ان میں ایک مضمون بدلہ اور قصاص کا آ رہا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ۝﴾

''اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو بدلہ لیتے ہیں۔''

یہ اس درس کی چوتھی آیت ہے' اور اس مضمون پر ایک بحث اگلی چار آیات پر محیط ہے۔ یہاں بظاہر ایک بڑا ہی مختلف انداز ہے اس سے جو عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ دین کی دعوت کے ضمن میں ہونا چاہئے اور جس کی تلقین واقعتاً قرآن مجید میں بھی دعوتِ دین کے ضمن میں کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ دعوت کے میدان میں اور دعوت کی سطح پر' دعوت کے مرحلے پر یہی مطلوب ہو گا کہ لوگ گالیاں دیں تو تم دعائیں دو' لوگ پتھر ماریں تو تم پھول پیش کرو۔ وہاں بدلہ لینا دعوت کے راستے کی رکاوٹ بن جائے گا۔ یہ قرآن مجید کا حسنِ ربط' حسنِ ترتیب' اور حسنِ اعجاز ہے کہ اس میں ہر سطح اور ہر مرحلے کے لئے ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ پچھلی سورت حٰمٓ السجدۃ کا مرکزی مضمون چونکہ دعوت ہے لہٰذا وہاں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۝﴾ ''نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کا جواب اس نیکی سے دو جو بہترین ہو' پھر تم دیکھو گے کہ جس شخص کی تمہارے ساتھ عداوت تھی وہ جگری دوست بن گیا۔'' گویا دشمن کے برے رویئے کے جواب میں حسن سلوک سے کام لینا' ان کی گالیوں کے جواب میں ان کو دعائیں دینا' ان کے تشدد اور ایذا رسانی کے جواب میں ان کی خدمتیں کرنا' یہ دعوت کی تاثیر کے لئے لازم ہے۔ لیکن کیا اہل ایمان کا یہی دائمی وصف ہو گا؟

اوّل تو یہ جان لیجئے کہ اقامت دین سے جو شے مطلوب ہے وہ اقامتِ عدل وقسط ہے۔ میں اپنے مختلف خطابات میں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ اکثر و بیشتر قانون کا

اقامت کے مرحلے پر بدلہ اور انتقام۔

چنانچہ آگے فرمایا: ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ ﴾ ''اور برائی کا بدلہ تو برائی ہے ویسی ہی''۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ اب وہ بھگشوؤں کا سا انداز نہیں رہا' اب وہ خانقاہیت والا نظام یہاں نہیں رہا۔ یہ تو بڑا جارحانہ اور militant انداز ہے۔ ان دونوں کا مقام اپنی اپنی جگہ پر ہے۔ ہر شے کو اس کے مقام پر رکھئے' اس کا نام عدل اور انصاف ہے۔ کسی چیز کو اپنے مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیں گے تو یہ ظلم ہے۔ ظلم کی تعریف ہے: ''وضع الشیء فی غیر محلّہ'' یعنی کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دینا''۔ ہر شے کو اس کے مقام پر رکھئے۔ یہاں ''مِثْلُهَا'' کے لفظ سے یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ جتنی زیادتی ہوئی ہے اتنی ہی زیادتی ہو' اس سے زائد نہیں۔ یہ نہ ہو کہ انتقام کے جوش میں آ کر ایک تھپڑ کے بدلے میں دس تھپڑ مارے جائیں۔ یہ جائز نہیں' بلکہ ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ ''برائی کا بدلہ تو ویسی ہی برائی ہے''۔

البتہ اس کے ساتھ ہی فرما دیا: ﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ ﴾ ''تو جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے''۔ یہاں ایک بڑا لطیف اشارہ کر دیا گیا کہ معافی اس صورت میں دی جائے اگر یہ نظر آ رہا ہو کہ اس سے اصلاح ہو جائے گی۔ ایسی معافی نہ ہو جو شریروں کی ہمت افزائی کا ذریعہ بن جائے۔ جہاں آپ یہ محسوس کریں کہ زیادتی کرنے والے پر واقعی ندامت طاری ہو چکی ہے اور اسے اپنے کئے پر بڑا پچھتاوا ہے' میں اگر اسے معاف کر دوں گا تو اس میں اصلاح کی کیفیت پیدا ہو گی' اور آپ اسے معاف کر دیں تو اس طرح آپ اپنے لئے بہت بڑا اجر کما سکتے ہیں۔

﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ ''اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا''۔ اگر عفو سے ظلم کی جڑ کٹ جاتی ہو' اصلاح ہو جاتی ہو تو عفو بہتر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں کہ ظالموں کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی ہو اور نیک لوگ کونوں کھدروں میں' خانقاہوں میں بیٹھے رہیں اور شریروں کے لئے دنیا چھوڑ دیں۔ انہیں شریروں کی سرکوبی

کے لئے میدان میں آنا ہوگا۔

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۞ ﴾ ''اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان پر کوئی ملامت نہیں''۔ میں نے عرض کیا تھا کہ دونوں چیزیں بیک وقت اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میرے معاف کر دینے سے اصلاح ہو جائے گی' بہتری کی توقع ہے تو معاف کر دے۔ اس کا اجر اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے معاف کرنے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے میں تو بدلہ لوں گا تو آپ اس کو ملامت کرنے کے درپے نہ ہو جائیں کہ دیکھو اچھا کام چھوڑ کر برا کام کر رہا ہے۔ یہاں واضح کر دیا گیا کہ جو کوئی بدلہ لے' انتقام لے اس کے بعد کہ اُس پر ظلم ہوا ہے تو ایسے لوگوں کے اوپر کوئی ملامت کا راستہ نہیں ہے' آپ انہیں discourage نہیں کر سکتے' آپ انہیں ملامت نہیں کر سکتے۔ وہ ان کا حق ہے' وہ بدلہ لے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں سورۃ النساء میں تو یہاں تک فرما دیا: ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ﴾ ''اللہ تعالیٰ کو کسی بری بات کا بلند آوازی سے کہنا پسند نہیں ہے' سوائے اس کے جس پر ظلم ہوا ہو''۔ مظلوم اگر اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے درد سے کراہتے ہوئے چیخ و پکار کرتا ہے اور اس کی زبان سے اگر کوئی برا کلمہ نکل جاتا ہے تو اسے معاف کیا جائے گا' اس سے درگزر کیا جائے گا۔ عام حالات میں بری بات کا زبان سے نکالنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو وہ مستثنیٰ ہے۔

﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ﴾ ''ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں''۔ لہٰذا اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے جو جماعت وجود میں آئے وہ منظم ہو کر ان لوگوں کے مقابل خم ٹھونک کر میدان میں آئے جو ظلم کر رہے ہیں' جو لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرتے ہیں' جنہوں نے لوگوں کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ یہ ظلم معاشرتی بھی ہوتا ہے' معاشی بھی ہوتا ہے اور سیاسی بھی ہوتا ہے۔ جو

لوگ دوسروں کو اپنا محکوم بنالیں' وہ ظالم ہیں۔ جو معاشی طور پر دوسروں کو مفلوج کریں' وہ ظالم ہیں۔ جو دوسروں کے حقوق پر دست درازی کریں' وہ ظالم ہیں۔ جنہوں نے کچھ لوگوں کو گھٹیا قرار دے دیا ہے' وہ سب سے بڑھ کر ظالم ہیں۔ اسی گوشت پوست کے بنے ہوئے اور ایک آدم وحوا کی نسل سے پیدا ہونے والے انسانوں میں سے بعض کو بڑھیا اور اعلیٰ قرار دے دینا اور بعض کو گھٹیا اور ادنیٰ سمجھنا بہت بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ ظلم خواہ معاشرتی سطح پر ہو یا معاشی سطح پر یا سیاسی سطح پر' جو بھی ظلم کا ارتکاب کر رہا ہے وہ ظالم ہے' اور سب سے بڑا ظلم اللہ کی زمین پر غیر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ہے۔ یہ زمین اللہ کی ہے' وہ اس کا جائز حاکم ہے' جو اس حاکمِ حقیقی کے خلاف بغاوت کر رہا ہے اور ناحق سرکشی کر رہا ہے اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا؟ چاہے اس نے کچھ خیراتی ادارے بھی قائم کر دیئے ہوں' فاؤنڈیشنز بنادی ہوں' چاہے وہ ویلفیئر سٹیٹ بنائے بیٹھا ہو' لیکن اللہ کا حق غصب کئے ہوئے ہے اور اللہ کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلوا رہا ہے۔

﴿ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۞ ﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جن کے لئے دردناک عذاب ہے''۔ ان ظالموں کے لئے آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے اور دنیا میں بھی تم اپنے غصے اور ملامت کا ہدف ان لوگوں کو بناؤ' نہ کہ اُن لوگوں کو جو مظلوم ہیں۔

ڈرو مظلوم کی آہوں سے جب اٹھتی ہیں سینوں سے
قبولیت ہے کرتی خیر مقدم چرخ سے آ کر!

یہ شعر دراصل فارسی کے اس شعر کا اردو ترجمہ ہے۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید!

ماہر القادری مرحوم کہتے ہیں کہ کوئی دعا ایسی بھی ہوتی ہے جس کی قبولیت کے لئے رحمت خداوندی پہلے سے بے تاب ہوتی ہے۔ دعا کریں تو سہی! ع ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں! ایک دعا وہ بھی ہے جس کے لئے حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کے پچھلے پہر سمائے دنیا پر نزول فرما کر ارشاد فرماتا ہے: ھَلْ مِنْ سَائِلٍ

فَاُعْطِیَهٗ؟ هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاُغْفِرَ لَهٗ؟ ''ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اسے عطا کروں؟ ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اسے بخش دوں؟؟ تو ماہر صاحب نے بھی اسی انداز میں ایک شعر کہا ہے ؎

یہ کون پچھلے پہر رات کو ہے محوِ سجود
دعا کو ڈھونڈ رہی ہیں ابھی سے تاثیریں!

بہر حال یہ ذہن میں رکھئے کہ یہ ظلم' یہ عدوان' یہ تعدی' یہ استحصال جس شکل میں بھی ہے ان لوگوں کے لئے ایک چیلنج ہے کہ جو اللہ کے بندے ہیں' جو اللہ کی زمین پر اللہ کی حاکمیت کے علمبردار ہیں' جو اس کے نظامِ عدل وقسط کے نام لیوا ہیں۔ ان کے خلوص واخلاص اور ان کی محبت خداوندی کا ثبوت یہ ہے کہ ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ﴾ ''اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون (ہیں اس کے وفادار بندے جو قوت کو ہاتھ میں لے کر' لوہے کو ہاتھ میں لے کر) اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں' غیب میں رہتے ہوئے''۔ اس کی مدد کیا ہے؟ اس کے دیئے ہوئے نظامِ عدل وقسط کا قیام' اس کے دین کا غلبہ! رسولوں کی مدد کیا ہے؟ کہ یہ اصلاً فرضِ منصبی رسول کا ہے' جو کوئی اس میں ہاتھ بٹاتا ہے وہ ان کا اعوان وانصار بنتا ہے۔

آخری آیت ہے: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝﴾ ''اور جو کوئی صبر کرے اور معاف کر دیا کرے' تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے''۔ اس راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر عفو ودرگزر کی ضرورت پیش آئے گی اور سب سے بڑھ کر اپنے ساتھیوں کے ضمن میں پیش آئے گی۔ ساتھی بھی تو ایک دوسرے پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں۔ حضور ﷺ کے ساتھ اپنوں نے کیا نہیں کیا ؎

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت!

یہ تو آج ہم کہتے ہیں کہ فلاں منافق تھا' فلاں منافق تھا' اس وقت تو وہ بظاہر حضور ﷺ کے ساتھی تھے' لیکن کیا کر رہے تھے؟ کیا کچھ کیا ہے عبداللہ بن اُبی نے! نہ معلوم کس کس

نے کس کس طور سے ایذا پہنچائی ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شکوہ نقل ہوا ہے: ﴿یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ﴾ (الصف: ۵) ''اے میری قوم کے لوگو! تم کیوں مجھے ایذا پہنچا رہے ہو درآں حالیکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں''۔ آپ اندازہ کیجئے کہ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے جب یہ الفاظ نکلے ہوں گے تو کتنا دکھا ہوا دل ہوگا۔ یہ فرعون اور آلِ فرعون کے مظالم کا شکوہ نہیں ہے' بلکہ اپنوں کے ہاتھوں جو چرکے اٹھائے ہیں ان کا ذکر ہے۔ تو بہرحال اس کا ایک محل تو یہ ہوگا کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ ہو ع ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم! لیکن ظالموں' کافروں اور زمین میں جو اللہ کے باغی ہیں ﴿الَّذِیْنَ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ اور اپنی حکمرانی کے دعوے دار ہیں ان سے انتقام اور بدلہ لیا جائے۔

آخر میں صرف ایک بات مزید نوٹ کر لیجئے کہ انقلابی تحریک کا ایک دور وہ ہوتا ہے جس میں حکم یہ ہوتا ہے کہ اس وقت اپنے ہاتھ روکے رکھو ﴿کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ﴾ یہ حکم مستقل نہیں ہوتا بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ اپنے غیظ و غضب کو اپنے اندر پالتے رہو' اپنے آپ کو منظم کرو اور ایک طاقت بن جاؤ! علامہ اقبال کا یہ شعر اسی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے ؎

نغمہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

ایک وقت آئے گا جب تمہارے ہاتھ کھول دیئے جائیں گے' پھر یہ لاوا پورے زور شور کے ساتھ نکلے گا۔ اور وہ اُس وقت نکلا جب قرآن میں یہ حکم نازل ہوا: ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ﴾ (الحج: ۳۹) ''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو (جنگ کی) جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے''۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم، ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم ○○

انسان کا پستی اور زوال کا حالیہ سفر
احیاء العلوم کے بعد کا یورپ اور آج کا اسلام

تحریر: عبدالحق بیولے (اخذ و ترجمہ: سردار اعوان)

مذہب سے لامذہبیت کی جانب انسان کے حالیہ سفر کے حوالہ سے ایک انگریز نومسلم کا پیش نظر مضمون خاصا معلوماتی اور حقائق پر مبنی ہے۔ تاہم اس میں ایک کمی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ مذکورہ تبدیلی کے پس پردہ کارفرما یہودی ذہن کی طرف مضمون میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ مضمون نگار کی اس جانب توجہ نہیں ہوئی یا مصلحت کے تحت انہوں نے اس ضمن میں کچھ نہیں کہا' اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ (ادارہ)

میں شروع میں ہی یہ عرض کر دوں کہ میری یہ ساری گفتگو اصلاً قرآن حکیم کے حوالے سے ہے جو اللہ کا آخری کلام ہے اور چودہ سو سال قبل نبی اکرم ﷺ پر نزولِ وحی سے لے کر آج تک کے تمام حالات و واقعات پر محیط ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ درحقیقت قرآن کے آغاز میں ہی' سورۂ فاتحہ میں موجود ہے۔

بات یہ ہے کہ گزشتہ چار سو سال میں انسان کے حالات میں تدریجاً ایک بہت بڑی تبدیلی لائی گئی ہے' جس کا مقصد اس کی سیاسی اور معاشی حیثیت ختم کر کے اس پر مکمل تسلط قائم کرنا ہے' ایک ایسا تسلط جس کی اس سے پہلے پوری انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ علم کی وسعتوں کو انسانی تجربات کا پابند بنا کر روحانی اقدار تک انسان کی رسائی کو ایسا مشکل بنا دیا گیا ہے کہ مادّی دنیا سے آگے خالق کائنات کی طرف اس کی توجہ ہی نہیں جاتی۔ اس چار سو سالہ عرصہ کے واقعات و محرکات کی پیچیدہ اور بدلتی ہوئی شکلوں اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی غیر یقینی کیفیت کے باوجود ہمارا یہ فرض ہے کہ قرآن میں درج حقائق کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ اپنے خالق کو مانیں اور اُس کی

پرستش اور بندگی کریں۔ یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری رہا ہے۔ لوگ ایک اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کرتے تھے' پھر رفتہ رفتہ ان کے عقائد اور اعمال میں بگاڑ پیدا ہونے لگتا تھا اور لوگ صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتے تھے' اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کوئی نبی یا رسول بھیج کر اُن کی اصلاح کر دیتا تھا۔ گویا کوئی بھی معاشرہ اُسی وقت تک صحت مند رہ سکتا ہے اور پھل پھول سکتا ہے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستہ پر قائم رہتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نیکی اور بھلائی کا راستہ چھوڑ کر بدچلنی کی روش اختیار نہیں کرتا' یا اگر کہیں قدم ڈگمگا جائیں تو دوبارہ اپنی اصلاح کر کے واپس صراطِ مستقیم پر لوٹ آتا ہے۔ آج کا ہمارا اپنا معاشرہ بھی اس اصول اور انسانی ضابطہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ آج بھی دُنیا ماننے اور نہ ماننے والوں پر مشتمل ہے اور یہ حقیقی کامیابی ماننے والوں ہی کے لئے مختص ہے۔

آغاز کے طور پر ہم بعض نمایاں تاریخی واقعات بیان کرتے چلیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ پندرہویں صدی کے عیسائی دور سے لے کر آج تک کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔ یہ واقعات ہیں: احیاءِ علوم (Renaissance)' اصلاحِ مذہب (Reformation)' انگریزوں کی خانہ جنگی' نام نہاد عظیم الشان انقلاب' فرانسیسی انقلاب' روسی انقلاب' پہلی جنگ عظیم' خلافت کا خاتمہ اور آخر میں دوسری جنگ عظیم۔ ان واقعات کی صرف تاریخ بیان کرنا پیش نظر نہیں ہے' بلکہ یہ بتانا ہے کہ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

''احیاءِ علوم'' صرف ایک واقعہ نہیں تھا' اس کی اپنی ایک شناخت تھی اور اس عمل میں' جسے میں خاص طور پر سامنے لانا چاہتا ہوں' اس کا بڑا بنیادی کردار تھا۔ احیاءِ علوم کے نتیجے میں دنیا کے بارے میں لوگوں کے نقطۂ نظر میں اہم تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ اس سے قبل دنیا کے بارے میں لوگوں کا تصور الہامی علم پر مبنی تھا۔ انہیں یہ ماننے میں ہرگز کوئی تامل نہ تھا کہ انسان' یہ دنیا' بلکہ پوری کائنات کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور وہی اسے چلانے والا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ مادّی دنیا اس وسیع کائنات کا ایک حقیر سا جزو

ہے۔ وہ مانتے تھے کہ فرشتوں اور روح کا وجود ہے اور اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہوگی' جہاں جنت بھی ہوگی اور دوزخ بھی' نیک اعمال کرنے والے جنت میں داخل کئے جائیں گے اور بداعمال جہنم رسید ہوں گے۔ یہ تھا وہ تصور جس کی بنا پر انسان کو اس کائنات میں فوقیت حاصل تھی۔ اللہ جو اِس کا خالق ہے' اس کے ساتھ بندے کا خصوصی تعلق ہے اور اس تعلق کے ناطے انسان لازمی طور پر اللہ کے ہاں جواب دہ ہے۔ زندگی کا یہ تصور انسان کا اللہ کے ساتھ وابستگی کا تصور تھا' لیکن احیاءِ علوم کے بعد یہ تصور بدل گیا اور دنیا کے بارے میں ایک بالکل نئے تصور نے جنم لیا۔ لوگ اپنے آپ کو الہامی علم سے مکمل طور پر آزاد خیال کرنے لگے اور کائنات کے بارے میں محض عقل کو سارے علم کی بنیاد قرار دے دیا گیا۔ دنیا کو برتنے کا سامان سمجھنے کی بجائے ملکیت بنا لیا گیا۔ نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی انسانی رویہ میں بے پناہ تبدیلیوں کا باعث بنی جن کے نتیجہ میں انسان بالآخر خود ہی اپنی تقدیر کا مالک بن گیا۔ یہ درحقیقت انسان کے لئے بڑا ہی گھاٹے کا سودا تھا۔

دنیاوی زندگی کا جدید تصور احیائے علوم ہی کی توسیع ہے۔ ۳۱/اکتوبر ۱۵۱۷ء کو مارٹن لوتھر نے اپنے پچانوے مقالات وٹن برگ (Wittenburg) میں چرچ کے دروازے پر چسپاں کر کے روم میں قائم چرچ سے جس آزادی کا اعلان کیا تھا وہ مذہب سے آزادی کا اعلان ثابت ہوا۔ اس سے لوگوں کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ غلط اور صحیح کا فیصلہ روایتی طریقہ سے مذہب کے حوالے سے کرنے کی بجائے اپنی آزاد مرضی سے کریں۔ اس سے یہ تصور پروان چڑھا کہ نیکی اور بدی کا انحصار حالات پر ہے۔ لوتھر کا روم سے ناطہ توڑنا مغرب میں سیاسی سطح پر عیسائیت کے وقار کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔

احیاءِ علوم کے نتیجہ میں لوگوں نے کلیسا کا قانون ماننے سے انکار کر دیا جس سے الہامی کتب پر مبنی اخلاقی تعلیمات بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک فرانسیسی شخص جان کیلون (John Calvin) نے جنیوا میں سود پر قرض دینا جائز

قرار دے دیا' حالانکہ اس وقت تک ایسا کرنا جرم تھا۔ اس سے ہمیں قرآن حکیم کی تعلیمات کی اہمیت کا احساس ہونا چاہئے جو ہر وقت اور ہر مقام کے لئے قابل تقلید ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شاید اسی موقع کے لئے ارشاد فرمایا تھا کہ ''وہ بہانہ بنائیں گے کہ تجارت اور سود کا لین دین ایک جیسے ہیں''۔ چنانچہ کیلون کا کہنا تھا کہ میرے نزدیک تجارت اور سود کے کاروبار میں کوئی فرق نہیں۔ ظاہر بات ہے اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا ہی سچ ہے۔ بہرحال سود کی اجازت سے یورپی معاشرے میں پہلے سے قائم زمیندار طبقہ کی جگہ ایک نیا طبقہ جس کے پاس پیسہ تھا' طاقت کا مرکز بن گیا۔ اس تبدیلی نے اخلاقی قدروں کے فقدان کے سبب بددیانتی اور معاشرتی ناہمواری کو جنم دیا۔

انگلینڈ میں احیاءِ علوم کا بہت ہی مکروہ' مگر ساتھ ہی بہت کھلا چہرہ ہنری ہشتم کے دَور میں سامنے آیا جس نے بڑی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوتھر اور کیلون کے تصورات کو عملی جامہ پہنایا۔ روم سے ناطہ توڑ کر اس نے چرچ آف انگلینڈ کی داغ بیل ڈالی' پھر خود اس کا سربراہ بھی بن گیا۔ کئی شادیاں رچانے کی خاطر شادی کا قانون ہی بدل دیا' راہب خانوں کی زمینیں اور جائیدادیں ہتھیائیں' سودی کاروبار کو قانونی تحفظ فراہم کر کے اپنا سودی کاروبار سجایا۔ ہنری نے اپنی ہوس اور لالچ کے تحت احیاء علوم سے فائدہ اٹھا کر جس عمل یعنی سودی کاروبار کو تقویت دی وہ بعد میں اس شاہی نظام کو ہی لے ڈوبا جسے ڈوبنے سے بچانا اس کی ایک اہم ذمہ داری تھی۔

اس کے بعد اگلا واقعہ انگلستان میں خانہ جنگی کا ہے۔ ہنری کی طرف سے سودی کاروبار کی کھلی چھوٹ سے فائدہ اٹھا کر تاجروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آ گیا جس نے اگلی صدی تک اتنی دولت اور طاقت حاصل کر لی کہ طاقت کا توازن پرانے جاگیردار طبقہ سے منتقل ہو کر اس نئے طبقۂ اشرافیہ کے حق میں ہو گیا۔ اس دوران ٹیوڈر خاندان' جس نے یہ سارا کھیل کھیلا تھا' اقتدار سے محروم ہو گیا اور تخت شاہی سٹیوارٹ خاندان کے پاس آ گیا۔ سٹیوارٹ خاندان نے فرانس کے شاہی خاندان کے ساتھ اپنے تعلقات کو بروئے کار لا کر رومن چرچ کے ساتھ دوبارہ تعلق استوار کر لیا۔ اگرچہ انہوں

نے چرچ آف انگلینڈ کی سرپرستی جاری رکھنے پر اتفاق کر لیا' لیکن عملاً انہوں نے پرانے معاشرتی نظام کا ساتھ دیا۔ چارلس اوّل کا' جو اپنے باپ جیمز اوّل کی جگہ تخت نشین ہوا' پختہ یقین تھا کہ وہ اللہ کے نمائندہ کے طور پر حکومت پر فائز ہے اور مذہبی قوانین کی بالادستی برقرار رکھنا اس کے ذمہ ہے۔ اس عقیدہ کی وجہ سے اُس نئے نظام کے ساتھ اس کا تصادم ناگزیر تھا جو اس دوران پروٹسٹنٹزم (Protestantism) کی انتہائی شکل میں سامنے آ چکا تھا اور جس کا سود کے بارے میں رویہ خاصا مشفقانہ تھا۔ نیز اس نئے طبقۂ اشرافیہ کا اس دَوران پارلیمنٹ پر پوری طرح تسلط قائم ہو چکا تھا' چنانچہ پارلیمنٹ نے براہِ راست شاہی اختیارات کو چیلنج کر دیا جس کے نتیجہ میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور بالآخر بادشاہ کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ اس سانحہ سے یورپ کا معاشرتی اور سیاسی ڈھانچہ یکسر تبدیل ہوگیا۔ بادشاہ کا کہنا تھا کہ وہ عوام کی خاطر اپنی جان دے رہا ہے' یہی دعویٰ اسے قتل کرنے والوں کا تھا' جبکہ ''قومی مفاد'' یہ برآمد ہوا کہ نہ صرف اقتدار ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ کو منتقل ہوگیا بلکہ ساتھ ہی صدیوں سے قائم معاشرتی نظام بھی بدل گیا۔ اس وقت تک سیاسی اختیارات بادشاہ کو حاصل تھے جو مذہبی قوانین اور اصولوں کے تحت حکومت کرنے کا پابند تھا۔ اس کے بعد سیاسی طاقت خفیہ ہاتھوں میں چلی گئی اور معاملہ یہ ہوگیا کہ آپ کسی کو بھی کسی غلط کام کے لئے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔

اولیور کروم ویل (Oliver Cromwell) نے سلطنت کے محافظ کا لقب اختیار کر کے پارلیمنٹ کے ذریعے انگلینڈ میں حکومت چلانے کا کام سنبھالا لیکن طاقت کا اصل مرکز وہ ساہوکار تھے جنہوں نے اسے خانہ جنگی کے دوران اور بعد میں فوجی اخراجات پورے کرنے کے لئے سود پر قرض دے رکھا تھا۔ چنانچہ یہ وہ دور تھا کہ بینکنگ کے ذریعے سودی کاروبار کو منظم طور پر میدان میں آنے کا موقع ملا۔

کروم ویل دَور کا دوسرا بڑا کارنامہ سیکولرازم کی ایجاد تھا۔ احیاءِ علوم سے قبل مذہب اور اخلاق کو معاشرہ کا لازمی جزو گردانا جاتا تھا۔ ہنری ہشتم نے اپنے آپ کو

چرچ کا سربراہ قرار دے کر مذہب اور حکومت کو ایک سطح پر رکھا تھا' کروم ویل کی کامن ویلتھ میں پہلی مرتبہ مذہب ریاست کے تابع ہو گیا۔ اس طرف کسی کی توجہ نہ ہوئی کہ یہ واقعہ تاریخ میں کتنی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ چنانچہ اس کے بعد مذہب کا حکومت میں عمل دخل ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا' اس لئے کہ مذہب اور ریاست کا باہمی رشتہ ہی باقی نہ رہا۔

اب اگلا واقعہ نام نہاد ''عظیم الشان انقلاب'' کا ہے۔ کروم ویل کی وفات کے بعد گو بادشاہت بحال کر دی گئی تھی' لیکن فقط سابقہ بادشاہت کی ایک علامت کے طور پر۔ اب بادشاہ سلامت کی حیثیت پارلیمنٹ کے ایک وظیفہ خوار کی تھی۔ چارلس اوّل کے بیٹے کو واپس لا کر چارلس دوم کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ گو اُس کے دَور میں تخت کی بحالی کے لئے کی جانے والی ایک آدھ نیم دلانہ کوشش بھی شامل ہے لیکن اس کا زیادہ عرصہ لاابالی پن اور عاشقانہ سرگرمیوں میں صرف ہوا۔ البتہ اس کے بھائی جیمز دوم نے انگلینڈ کو دوبارہ کیتھولک مذہب پر لانے کی بھرپور کوشش کی' مگر اس میں ظاہر ہے نئے اشرافیہ کی موت تھی اور ان کے پاس طاقت بھی تھی جس کا مظاہرہ اس سے قبل چارلس اوّل کے خلاف جنگ اور اسے پھانسی دے کر کیا جا چکا تھا۔ اس کے بیٹے کو محض نمائشی طور پر لایا گیا تھا۔ پارلیمنٹ' جو بظاہر عوام کی نمائندہ لیکن اصلاً نئے سرمایہ دار طبقہ کے مفادات کی نگہبان تھی' اس کا ہالینڈ میں پرنس آف اورینج' ولیم' جس کی جیمز کی بیٹی میری (Mary) سے شادی ہو گئی تھی' کے ساتھ گٹھ جوڑ ہو گیا اور اسے اس شرط پر انگلستان کے تخت پر لا بٹھایا گیا کہ انتظامی اختیارات پارلیمنٹ کے پاس رہیں گے۔ غالباً پہلا قومی بینک' بینک آف انگلینڈ ولیم کے دَور حکومت کا مرہونِ منت ہے۔ قومی بینک ان معنوں میں نہیں کہ یہ قوم کی ملکیت تھا —— یہ خالص نجی ملکیت تھا —— بلکہ اس لئے کہ کرنسی کے کنٹرول اور حکومت کو قرض کی فراہمی پر اسے اجارہ داری حاصل تھی۔ حکومت نے چونکہ فی الواقع بھاری رقوم قرض پر لے رکھی تھیں لہٰذا اس لئے بھی یہ قومی بینک تھا کہ پوری قوم اس کی مقروض تھی اور حکومت لوگوں کے ٹیکسوں سے بینک کو

سود ادا کرنے کی ذمہ دار تھی' گویا یہ قومی قرضہ کا آغاز تھا اور آئندہ حکومت مالی لحاظ سے بینک مالکان کی دست نگر تھی۔ ایک ڈیڑھ صدی کے اندر اندر اتنی بڑی تبدیلی رونما ہوگئی کہ جو لوگ اس سے پہلے سودی کاروبار کی بنا پر قابل نفرت مجرم گردانے جاتے تھے وہ اس عرصہ میں مختارِ کل بن گئے۔

ولیم دَور کا دوسرا اہم کارنامہ پارلیمنٹ کا منظور کردہ قانون رواداری (Toleration Act) تھا جس کا مقصد اگرچہ مذہبی آزادی دینا تھا مگر عملاً اس کا فائدہ سیکولرازم کو ملا۔ قانوناً تمام مذاہب کو برابری کا درجہ دینے کا مطلب سرکاری طور پر الہائی کتب کے حوالہ سے اخلاقی ضوابط کی نفی تھا' جس کے بعد نیکی اور بدی کا تعین وقت کے تقاضوں اور معاشی ضرورت کے تحت ہو گیا۔ اس سے قبل ہر قسم کی قانونی کارروائی میں مذہبی اصولوں کو فوقیت حاصل تھی' اب مذہب صرف ایک نجی معاملہ رہ گیا' حکومتی سطح پر اس سے کوئی سروکار نہ رہا جس سے دنیاوی زندگی سرے سے مذہب سے خالی ہوگئی۔

امید ہے اب تک واقعات کا جو سلسلہ بیان ہوا ہے اس سے حالات کو سمجھنے میں مدد ملی ہوگی۔ ہم نے اس سلسلہ کا آغاز ایک ایسے یورپ سے کیا تھا جو تمام تر گمراہیوں کے باوجود بہرحال مذہب کے حوالہ سے مشترک اقدار اور طرزِ زندگی کی بنا پر آپس میں جڑا ہوا تھا۔ صدیوں سے قائم ایک معاشرتی نظام موجود تھا۔ احیاءِ علوم کی ابتداء کے ساتھ ہی اس ہم آہنگی میں رخنے پڑنے لگے۔ اگلے بڑھنے والے ہر قدم کے نتیجے میں دو چیزیں سامنے آتی ہیں' یعنی پرانے نظام کی شکست و ریخت اور مذہب سے دوری جس کی بنیاد پر یہ معاشرہ قائم تھا اور دوسرے سودی کاروبار کرنے والے طبقہ کا اندرونِ خانہ اقتدار پر قبضہ' جو پرانے نظام کی شکست و ریخت کے ذریعہ ممکن ہوا۔ یہاں چونکہ تفصیل میں جانا ممکن نہیں ہوگا لہٰذا ہم صرف مختلف مراحل میں ہونے والے انکشافات تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے۔

اس کے بعد ہم انقلابِ فرانس کی طرف آتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ انقلاب کا مقصد پرانے نظام سے گلوخلاصی حاصل کرنا تھا جس میں حکمرانوں اور مذہب سمیت

سب کچھ شامل تھا۔ گزشتہ صدی کے دوران جو کچھ انگلستان میں وقوع پذیر ہو چکا تھا' فرانس کے انقلاب نے ہر اعتبار سے اس میں اضافہ کیا' یہاں تک کہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ الحاد کو قانون کا درجہ دیا گیا۔ عوام کے نام پر یہاں بھی بادشاہ کو قربانی کا بکرا بننا پڑا۔ ادھر جب ہنگامہ تیز ہونا شروع ہوا تو انقلاب مدھم پڑ چکا تھا۔ ساہوکار ایک بین الاقوامی بینکاری نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے جو یورپ سے باہر تک جا چکا تھا۔ انقلاب فرانس کے ساتھ پہلی مرتبہ مسلمان اس میدان میں وارد ہوئے۔ اس وقت تک مسلم ممالک میں شرعی نظام رائج تھا لیکن انقلاب کی طاقت کے زور پر نپولین نے جب مصر میں قدم رکھا تو یورپ کے مضر اثرات ساتھ آئے۔ چنانچہ مصر میں پہلے پہل شراب کی فروخت شروع ہوئی' بینک کا قیام عمل میں آیا اور مصری طلبہ فرانس جا کر تعلیم حاصل کرنے لگے۔

یورپ میں عیسائیت کا ایک دوسرا گڑھ روس اس لئے بچا ہوا تھا کہ اس کا تعلق ایسٹرن آرتھوڈکس (Eastern Orthodox) سے تھا' جبکہ اولاً حملے کا رخ زیادہ تر رومن چرچ کی طرف رہا تھا۔ یہاں جب انقلاب آیا تو بادشاہ کے ساتھ اس کے پورے خاندان کا صفایا کر کے ہمیشہ کے لئے اس کا قصہ پاک کر دیا گیا۔ الحاد کی اجازت ہی نہیں' ہر ایک کے لئے اسے لازمی قرار دے دیا گیا۔ مذہب پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں' پہلی جنگ عظیم میں تبدیلی کا یہ عمل بلا روک ٹوک جاری رہا۔ یورپ میں پرانی تہذیب کے بچے کھچے اثرات آسٹرو ہنگرین' سابقہ رومن سلطنت کے انہدام اور جرمنی کی تذلیل کے بعد ختم ہو گئے۔ اس کے بعد یہی حشر مسلمانوں کا ہونے والا تھا۔ برطانیہ نے عربوں کو خلافت عثمانیہ کے خلاف کھڑا کر کے اس کے حصے بخرے کر دیئے۔ عراق' اردن اور فلسطین کا علاقہ اپنے پاس رکھ لیا' شام اور لبنان فرانس کو دے دیئے۔ مقصد خلافت کا خاتمہ اور سیکولرازم کا قیام یقینی بنانا تھا۔ اس تصادم کا اصل فائدہ جن لوگوں نے حاصل کیا' وہ تھے اسلحہ بنانے والے اور سود پر

قرض فراہم کرنے والے۔ بھاری رقوم کا قرض پر لین دین ہوا جس سے دنیا میں پہلی مرتبہ بین الاقوامی قرضوں کی بنیاد پڑی۔ جنگ کے بعد اخلاقی رویوں میں نمایاں بگاڑ اور قومی بینکوں میں قابل رشک اضافہ دیکھنے میں آیا۔

اب ہم اس داستان کے آخری حصہ کی طرف آتے ہیں جو دوسری جنگ عظیم سے لے کر آج تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ احیاء علوم سے جس عمل کا آغاز ہوا تھا وہ اب پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ پرانی تہذیب کے صرف کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ سیاسی زبان میں مذہب اب بس ایک غیر متعلق قسم کی شے ہے جو صرف نمائش کے کام آتا ہے یا پھر اس سے ثقافتی تشخص معین ہوتا ہے' ورنہ روایتی اخلاقی قدروں کا جہاں تک تعلق ہے ان کا اب کہیں وجود باقی نہیں رہا۔ پوری دنیا سودی نظام کے آہنی شکنجے میں جکڑی جا چکی ہے۔ کسی میں دم خم نہیں کہ اس کے خلاف زبان کھول سکے۔ پوری دنیا میں بظاہر پارلیمانی جمہوریت کا ڈنکا بج رہا ہے لیکن پس پردہ اصل طاقت کے بارے میں کسی کو علم ہے نہ اس تک رسائی حاصل ہے۔

ہم نے تاریخ کے ایک دور کا مطالعہ کر کے جس عمل کی نشاندہی کی ہے' قرآن کی رو سے وہ محض زمانہ کی گردش کا حصہ ہے جس کا ہم نے ابتداء میں ذکر کر دیا تھا۔ یہ ہر اس معاشرہ کی داستان ہے جو اصل راہ سے بھٹک کر گمراہی میں پڑ جاتا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ مسلمان اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اگرچہ اس عمل کا اصل ہدف یورپ اور اس کی ناجائز اولاد شمالی امریکہ والے تھے لیکن عملاً پوری دنیا آج مذہب سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آخری کلام کے حامل مسلمان خاص طور پر نشانہ بنے ہیں۔ خلافت کے خاتمہ اور سیکولرازم کی ترویج کے بعد اسلام پوری دنیا میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ مسلمان تو بہت ہیں' اسلام کہیں نہیں۔ سلیم الفطرت اشخاص بھی دیانت اور امانت کے وصف سے محروم ہیں۔ انسان سے مراد اگر ایسا شخص ہے جس کا اللہ اور آخرت پر مکمل یقین ہے' جو اللہ کی قائم کردہ حدود کے اندر زندگی بسر کرتا ہے' اللہ کے رسولؐ کی پیروی کرتا ہے' تو ایسا شخص شاید ہی اب دنیا میں موجود ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انسانوں

میں سے بعض حیوان ہی نہیں' حیوان سے بدتر ہیں۔ چنانچہ اصل انسان دنیا سے معدوم ہو رہا ہے۔

زندگی کا جو شعبہ سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے وہ علم کا شعبہ ہے۔ قرآن میں بنیادی طور پر دو طرح کے علوم کا ذکر ہے۔ ایک وہ جس کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالہ سے سورۃ الانعام میں ہے' یعنی مشاہداتی علم' کہ انسان اپنے علم اور مشاہدہ کے ذریعے صفاتِ باری تعالیٰ تک رسائی حاصل کر لے۔ یہ اصل میں اس علم کی تصدیق ہے جو اللہ تعالیٰ نے الہامی طور پر ہر انسان کو ودیعت کر رکھا ہے۔

دوسرے علم کا ذکر سورۃ القصص میں ہے۔ آیت ۳۸ کا ترجمہ ملاحظہ ہو: ''فرعون کہنے لگا: اے اہل دربار! میں نہیں سمجھتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور خدا ہے۔ ہامان! ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لئے ایک اونچی عمارت تو بنوا' شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے ربّ کو دیکھ سکوں' مجھے تو یہ شخص (معاذ اللہ) جھوٹا معلوم ہوتا ہے''۔ علم کی یہ شاخ کٹ حجتی پر مبنی ہے' حق کی پہچان اس کا مقصود ہی نہیں ہے۔ اس کی دوسری مثال سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے حوالہ سے ہے جنہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چونکہ عمل کرنے کا ارادہ نہیں تھا لہٰذا تحقیق و تفتیش کے ذریعہ اسے مؤخر کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔

پہلا طریقہ کہ دل میں اللہ کا یقین ہے' لہٰذا ہر شے کو اس کے حوالہ سے پرکھا جائے' جو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے' اب دنیا میں کہیں باقی نہیں رہا۔ ہم جو علم حاصل کرتے ہیں وہ دوسری طرز کا ہے جسے سائنسی علم کہا جاتا ہے۔ اس میں اللہ کے وجود سے کوئی بحث نہیں۔ اس علم کے ماہر کوپرنیکس (Copernicus)' گیلیلیو' نیوٹن' بوائل (Boyle)' ڈارون جیسے اشخاص تھے۔ سائنس کی ترقی کے نتیجے میں ایک عام آدمی کا اللہ پر یقین متزلزل ہوا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں انسان نے جس حیرت انگیز کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور اس سے لوگوں کو جو آسائشیں فراہم ہوئی ہیں ان کی بنا پر یہ باور کرانے میں مدد ملی ہے کہ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے سائنس اور

ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی ہی اصل شے ہے۔ یہاں ٹیکنالوجی کی حقیقت پر قدرے غور کرلیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لوگ ٹیکنالوجی کے مظاہر کو الگ تھلگ طور پر دیکھتے ہیں یعنی ہوائی جہاز' کمپیوٹر' دل کی پیوند کاری' ٹیلی ویژن' نیوٹران بم' کریڈٹ کارڈ۔ انہیں سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ سب ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں اور یہ درخت اُگا ہے اُس علم کے بیج سے جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ یہ محض ایک علمی بات نظر آتی ہے لیکن جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں اور یہاں جو مذہب سے بغاوت کا رجحان پروان چڑھا ہے اسے سمجھنے کے لئے اس بات کی خاص اہمیت ہے۔

ٹیکنالوجی کا عمل' جس نے یہ سب انڈے بچے دیئے ہیں' اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اس کے نزدیک باقی ہر شے کی حیثیت جمع پونجی کی ہے' یعنی اس کا سوائے اس کے اور کوئی مقصد وجود نہیں کہ اسے جب اور جس طرح چاہیں اپنے فائدہ کے لئے برت لیں۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہے اس پر تسلط حاصل کرو اور اپنے استعمال میں لاؤ۔ پن بجلی کے منصوبہ کے لئے دریا کی اہمیت صرف یہ ہے کہ اس کے اندر طاقت ہے۔ موٹر کار کے لئے زمین کا مصرف یہ ہے کہ اسے سڑکوں اور سروس سٹیشنوں سے بھر دیا جائے۔ ویڈیو ٹیلی سکوپ کے لئے کائنات اس لئے ہے کہ اسے پیمائش کر کے درج کرلیا جائے۔ ایسی لاتعداد مثالیں ہیں لیکن قابل نفرت حد تک صاف اور واضح۔ کسی شے کا وجود بذات خود کچھ نہیں' سوائے اس کے کہ اسے استعمال کرلیا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ خود انسان اس عمل کی زد میں آ گیا ہے۔

پہلے زمانہ کے لوگ ہر شے کی اس کی اپنی جگہ قدر کرتے تھے۔ پہاڑوں' درختوں' سورج وغیرہ کی پوجا تک کرتے تھے۔ ٹیکنالوجی کا ماہر ہر شے کو محض برتنے کی چیز سمجھتا ہے۔ قرآن کی رو سے اللہ نے ہر شے کو بامقصد (بالحق) پیدا کیا ہے' گویا ہر شے بذاتِ خود قدر و قیمت کی مالک ہے۔ انسان ان چیزوں کو استعمال میں لائے' مگر ان کی قدر کرتے ہوئے۔ ٹیکنالوجی کی ضرورت کے تحت دوسری کسی شے کے سرے سے کوئی حقوق نہیں۔ ٹیکنالوجی کی سرشت میں ہے کہ دنیا کی ہر شے پر اپنا تسلط قائم کرنا اس کا حق

ہے' مگر اس پر کسی شے کا کوئی حق نہیں' جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کا ماہر باقی انسانوں کو بھی برتنے کی چیز شمار کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کس لئے ہیں؟ اس لئے کہ ان سے کام لیا جائے۔ انہیں بطور صارف' بطور مارکیٹ' بطور انسانی قوت (potential) استعمال میں لایا جائے۔ انسان کی عزت انسان ہونے کے ناطے نہیں رہ گئی۔ جب انسان کی حیثیت محض ایک کارآمد شے کی رہ گئی تو انسان کا انسان ہونا اور انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا کیا سوال؟

ہم یہ نہیں کہتے کہ ٹیکنالوجی حرام شے ہے' نہ ہی یہ کہ واپس قدیم دور کی طرف لوٹ جائیں۔ ٹیکنالوجی کی یہ خاصیت ہے کہ جہاں اس کے قدم پڑتے ہیں پھر واپس نہیں پلٹتے' یہ ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔ یہ خیال مغالطہ آمیز ہی نہیں' خطرناک ہے کہ مغرب کی ٹیکنالوجی سے فوائد حاصل کر کے انہیں اسلام کا رنگ دینا ممکن ہے۔ یہ بات ٹیکنالوجی کی اصل سے عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ جب تک آپ کو اس بارے میں پوری آگاہی نہیں ہوگی آپ اس کے شکنجے میں پھنس کر سچائی کے راستہ سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔

دولت اور اقتدار کی ہوس سودی نظام کا عطیہ ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں' آج پورا عالم سودی نظام کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ سود خور طبقہ اور اس کے حکومتی نمائندوں کا کردار ڈھکا چھپا نہیں۔ اس نے بادشاہوں کو قتل کروا کر اقتدار حاصل کیا ہے۔ موجودہ حکمرانوں کا عوام کے ساتھ تعلق آقا اور غلام کا ہے۔ غلام سے کسی مثبت کردار کی توقع کرنا عبث ہے' وہ زیادہ سے زیادہ اپنا ردعمل ظاہر کر سکتا ہے۔ آج کی دنیا اسی ردعمل کے فلسفہ پر چل رہی ہے۔ لوگوں کی اکثریت اسی پر قانع ہے کہ انہیں اختلافِ رائے کا حق حاصل ہے' یعنی معاشرہ کا انحصار باہم اعتماد کی بجائے عدم اعتماد پر ہے۔ لوگ صرف ایک معین منطقی استدلال کے اندر رہتے ہوئے اپنی سوچ کو بروئے کار لا سکتے ہیں' اس سے باہر نکلنا ان کے بس میں نہیں۔ دائیں/بائیں' ترقی پسند/رجعت پسند' مشرقی/مغربی' شمالی/جنوبی' جدت پسند/بنیاد پرست وغیرہ' ایسے متعدد باہم متضاد

جوڑے ہیں اور آپ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ لازماً منسلک ہیں۔ منطق ایک ایسے ہال کی طرح ہوتی ہے جس میں ہر طرف آئینے لگے ہوں۔ مخالف عکس ایک دوسرے پر مسلسل منعکس ہوتے رہتے ہیں جس کا کوئی سدباب نہیں۔ منطقی بحث میں کبھی نہ پڑیں' کیونکہ اس کا حاصل ہر حال میں تصادم ہے۔ اس کے باوجود ہم میں سے اکثر اسی جال میں جا پھنستے ہیں۔ عمل کی آزادی تو ہے نہیں کہ کسی اصلاح کا امکان ہو' لہٰذا نتیجہ ہر حال میں علیٰ حالہ (status quo) ہے۔ سسٹم نے اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لئے لوگوں کے کچھ کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رکھی۔

عیسائیت کا ایک خاص مرض احساسِ جرم کا ہے' لہٰذا انہوں نے پوری دنیا کو اس مرض میں مبتلا کر دیا ہے اور چاہتے ہیں کہ لوگ اپنے آپ کو مطعون کرتے رہیں۔ مصیبت میں ہونا ان کے اعتبار سے اچھی بات ہے اور ان کے منطقی استدلال کے عمل کے تحت خوشی کا بے ساختہ اظہار بے شرمی ہے۔ یعنی منفی قوت کی بالادستی' مثبت قوت کی حوصلہ شکنی۔ اس کا نتیجہ ہے بے رحمی' ناامیدی اور اجنبیت۔ آج ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس میں آپ کو یہی کچھ نظر آئے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ جب تک ہم یہ نہیں سمجھیں گے' علاج نہیں ہوسکتا۔ چار چیزیں ہیں جنہوں نے ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے: سائنسی طور طریقہ' سودی معیشت' قیادت کی بربادی اور منطقی استدلال کے ذریعہ بالادستی۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں بتایا تھا کہ ہمارے پاس اللہ کا آخری کلام' قرآن حکیم موجود ہے۔ اس وقت جس طرح ہم لادینی قوتوں کے گھیرے میں آچکے ہیں اس سے نکلنے کا واحد ذریعہ قرآن حکیم کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال سامنے رکھتے ہوئے ہمارا سارا توکل اور بھروسہ اللہ پر ہونا چاہئے۔ اگر ہم واقعتاً عقل اور ہوش سے کام لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں صفاتِ باری تعالیٰ تک رہنمائی حاصل نہ ہو۔ ہمارے لئے پہلے عمل اور تحریک ہے' مقصد اور سبب بعد میں۔ اس لئے کہ علاج اور دوا موجود ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے' پانی' بارش' نباتات' چرند' پرند' حیوانات ہر شے اللہ کے حکم کے تابع ہے۔ یہ کوئی مدح سرائی نہیں' حقیقت ہے۔

اسی حقیقت کی پہچان تھی جس نے صحابہ کرام ؓ کو بیس سال کے مختصر عرصہ میں آدھی دنیا تک پہنچا دیا۔ اللہ کے دین کو دنیا میں غالب کرنے کے لئے ایسا یقین درکار ہے۔ ہمیں اس یقین سے ایک سازش کے تحت محروم کیا گیا ہے لیکن ہم عقل سے کام لے کر دوبارہ اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

ٹیکنالوجی میں جو کمی ہے وہ اشیاء کی ناقدری کرنا ہے' نہ صرف اشیاء بلکہ انسان کی بھی ناقدری۔ اللہ نے ہر شے کو بامقصد پیدا فرمایا ہے' ہم کسی شے کے مالک نہیں ہیں' مالک ہر شے کا اللہ ہے۔ ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جس شے سے جو چاہیں' سلوک کریں۔ ہمارا کام توازن قائم رکھنا ہے اور اللہ نے جو حدود مقرر کی ہیں ان کے اندر رہنا ہے۔ اس سے بھی آگے ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ٹیکنالوجی کے حوالہ سے مادہ پرستی کو جو فروغ حاصل ہوا ہے' اسے رد کر کے اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں' ان معاملات کے ضمن میں قرآن اور حدیث کی طرف نئے سرے سے رہنمائی کے لئے رجوع کریں۔ ایسا نہیں کہ آج ہمیں جو مسائل درپیش ہیں ان کے لئے ہمارے پاس کوئی رہنمائی نہیں ہے' بلکہ ہم نے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اللہ کے آخری کلام کے حامل ہم ہیں' لہٰذا ہماری ذمہ داری ہے کہ نہ صرف خود بلکہ پوری نوع انسانی کو نجات کی راہ دکھائیں۔ اس کام کے لئے کمربستہ ہونے کی ضرورت ہے' ورنہ اللہ کے ہاں ہم جواب دہ ہوں گے۔

سود کو اللہ اور رسولؐ نے قطعی حرام قرار دیا ہے۔ سود کی حرمت کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے آخری خطاب خطبۂ حجۃ الوداع میں خصوصیت کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی اور قرآن حکیم کی آخری آیت بھی اس کی حرمت کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر ہم نے عملاً بھی اس کی تباہ کاری دیکھی' جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا ہے۔ دنیا سے مذہب اور اخلاق کا جنازہ نکالنے میں سودی معیشت کا گہرا عمل دخل ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم اس لعنت کے خلاف میدان میں آنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو ہمیں اپنے ایمان اور اسلام کی فکر کرنی چاہئے۔ ہمیں

چاہئے کہ اس کا ادراک کریں اور دوسروں کو اس کا احساس دلائیں' سود کی تباہ کاریاں اور انسانیت پر اس کے برے اثرات سے لوگوں کو آگاہ کریں تا کہ اسے نیست و نابود کرنے کی راہ ہموار ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے لئے کاروبار کے جائز ذرائع تلاش کرنے پر بھی توجہ دینی چاہئے تا کہ ایک متبادل نظام وجود میں لاسکیں۔ سونے چاندی کے سکے رائج کرنے پر غور ہونا چاہئے۔ یہ ہمارے کرنے کے اصل کام ہیں۔ نوع انسانی کی بقا کے لئے سود کا خاتمہ ناگزیر ہے۔ آیئے ہم سب مل کر اس کے خلاف جدوجہد کا آغاز کریں۔

انسانیت کے خلاف دوسری بہت بڑی سازش پس پردہ حکومتی نظام ہے۔ ہمارے پاس اس بارے میں دوٹوک' واضح رہنمائی موجود ہے۔ یہ امارت کا نظام ہے جو ہمیں قرآن وسنت سے ملتا ہے۔ سیاسی اختیار ایک شخص کو تفویض کیا جاتا ہے اور دوسرے سب لوگ اس سے بیعت کرتے ہیں جو امیر کی فرمانبرداری اور وفاداری پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ نظام لوگوں کو اللہ کی خاطر باہم بھائی بھائی بن کر رہنے کے مواقع فراہم کرتا ہے جو کہ اسلام کا مدعا ومقصود ہے۔ امارت کے بغیر اسلام قائم ہونے کا کوئی تصور نہیں۔ ہمیں موجودہ کمیٹی نظام کو خیر باد کہنا ہے' یہ انقلاب فرانس کی باقیاتِ سیئات ہیں' برے درخت کا برا پھل! اس کا مقصد دھوکے بازی کے ذریعہ حکومت حاصل کرنا یا مکمل جمود ہے۔ اس طرح کے ہتھکنڈے اسلام کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتے' نہ ہمیں ان چکروں میں پڑ کر اپنے آپ کو ذلیل وخوار کرنا چاہئے۔ نام نہاد جمہوریت دھوکہ بازی کے سوا کچھ نہیں۔ جو لوگ شوریٰ کو جمہوریت کے مترادف قرار دیتے ہیں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شوریٰ کی اہمیت اور لزوم اپنی جگہ لیکن فیصلہ کا اختیار بہر حال امیر کو حاصل ہوتا ہے۔ اس میں اکثریت یا اقلیت کا ہرگز کوئی تصور نہیں' نہ ہی امیر شوریٰ کے فیصلہ کا پابند ہوتا ہے۔ امارت کو غلط طور پر جابرانہ حکومت اور ناانصافی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے درحقیقت ہم آہنگی اور عدل و انصاف کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا غلط تصورات سے جان چھڑائیں اور امارت کی طرف آئیں' پھر دیکھیں حالات کیسے پلٹا

کھاتے ہیں۔

آخر میں نفسیاتی اثرات کا جائزہ لیتے چلیں جس کا سب سے بڑا مظہر منطق اور احساسِ جرم کا پایا جانا ہے' عوام میں اس احساس کا سرایت کر جانا کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ آج مسلم' غیر مسلم دونوں اس احساسِ محرومی کا شکار ہیں۔ یہ ایک طرح کا خواب (hypnotism) ہے۔ جب تک آپ اس عمل کے زیرِ اثر رہیں گے' اپنے آپ کو بے بس پائیں گے۔ ہم منطق کے سحر میں گرفتار ہیں' آج اسے خیر باد کہہ دیں' آپ آزاد ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس مکمل رہنمائی موجود ہے لیکن اس کے باوجود ہم غیروں کے سحر میں مبتلا ہیں۔ اللہ کی جانب آئیں تو سہی! منطق کا کام مخالف کا توڑ کرنا ہے۔ آپ ایک اللہ کے ہو جائیں' مخالفت کس بات کی! اللہ کی کتاب میں ہر کام کے بارے میں رہنمائی موجود ہے۔ ایک خوبصورت مثال ہمیں ان الفاظ میں ملتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے وحی کے ابتدائی دور میں خطاب کرتے ہوئے فرمائے:

﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۞ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۞ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۞﴾ (الضحیٰ:۹۔۱۱)

''پس تم یتیم پر سختی نہ کرو۔ اور سوال کرنے والے کو مت جھڑکو۔ اور اپنے ربّ کی نعمت کا اظہار کرو!''

یہاں دو اہم اصول سامنے آتے ہیں جن کا ہمارے ساتھ خصوصی تعلق بنتا ہے۔ اگر ان پر متواتر عمل کیا جائے تو منطق کا تانا بانا ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ پہلا اصول یہ کہ جہاں تک ممکن ہو کسی شے کی نفی نہ کریں' بلکہ تائید کریں۔ دوسرا یہ کہ جیسی بھی صورتِ حال ہو اس کا مؤثر اور مثبت انداز میں سامنا کریں۔ مقابلہ نہیں' مطابقت پیدا کریں۔ ہمیں جس قدر جلد ممکن ہو' منطق کے پھیلائے ہوئے اس جال سے باہر آنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جہاں تک احساسِ جرم کا تعلق ہے اس کی چھوت بہت سارے مسلمانوں کو لگ چکی ہے' حالانکہ اسلام میں ایسی کسی نفسیاتی بیماری کا نام و نشان نہیں۔

جرم کا احساس' واقعی یا خیالی' اگر انسان کے اندر گھر کر لے تو اس کا نتیجہ مایوسی اور کم ہمتی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ اللہ نے ہمارے لئے توبہ کا دروازہ کھول کر اس بیماری کا ہمیشہ کے لئے سدباب کر دیا ہے۔ انسان کسی بھی وقت توبہ کر کے غلط راستہ سے نیکی کی طرف آ سکتا ہے۔ انسان کہیں ٹھوکر کھا کر گر جاتا ہے تو وہاں پڑا تو نہیں رہتا' اٹھتا ہے اور اپنا راستہ لیتا ہے۔ یہی معاملہ توبہ کا ہے' انسان غلطی کرتا ہے' مگر فوراً اللہ کی جناب میں توبہ کرتا ہے اور اصل راہ پر واپس آ جاتا ہے۔ اللہ بہت رحم فرمانے والا ہے' اس کی رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

اللہ نے ہمارے لئے فرمایا ہے:

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۳۹)

''تم ہی غالب ہو گے اگر تم حقیقت میں مؤمن ہوئے۔''

اللہ کی کتاب پڑھ کر دیکھیں' ایسے مؤمنوں کے لئے بشارت ہی بشارت ہے۔ ان کے لئے فتح و نصرت کے وعدے ہیں۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بیس سال کے اندر اندر مسلمان کہاں سے کہاں پہنچ گئے! اُس وقت کی دنیا کی عظیم طاقت سلطنت روما کا بیشتر حصہ' پورا فارس اور شمالی افریقہ کا بہت بڑا علاقہ مسلمانوں کے زیر تسلط آ چکا تھا۔ لیکن یہ ایسے ہی بیٹھے بٹھائے نہیں ہو گیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس مقصد کے حصول کے لئے جان اور مال کھپائے' مصائب و مشکلات کا سامنا کیا' مشقتیں جھیلیں' تب کہیں جا کر روشنی دیکھنا نصیب ہوئی۔ انہیں چونکہ یقین تھا کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور سچ ہے اس لئے انہوں نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا' ورنہ جہاں تک اسباب اور وسائل کا تعلق ہے کیا یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ایک چھوٹی سی جماعت بڑے بڑے فرعونوں کو زیر کر سکتی ہے! ہمارے لئے اللہ کا الگ قانون نہیں ہے۔ وہی اللہ کی کتاب جو اُن کے پاس تھی' ہمارے پاس ہے۔ اللہ کا وعدہ ہمارے لئے بھی وہی ہے' بات عمل کرنے کی ہے۔

نصر من اللہ وفتح قریب!!

مسلمان کا طرزِ حیات (۳۲)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق تالیف

"منهاج المسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم: مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب الاخلاق

پہلا باب

حسنِ خُلق

''خُلق''[1] اس پختہ نفسیاتی کیفیت کو کہتے ہیں جس سے وہ اچھے یا بُرے افعال صادر ہوتے ہیں جو ارادہ و اختیار سے کئے جاتے ہیں۔ یہ فطری طور پر اچھی یا بُری تربیت کا اثر قبول کرتی ہے۔ اگر اس کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ وہ حق اور بہتر عمل کو ترجیح دینے لگے' معروف سے محبت رکھے' بھلائی کی طرف راغب ہو' اور اُسے اچھے کاموں سے محبت اور بُرے کاموں سے نفرت کا عادی بنا دیا جائے' حتیٰ کہ یہ چیز اس کی فطرت بن جائے اور اس سے اچھے اعمال و افعال آسانی سے بلا تکلّف صادر ہونے لگیں تو اس کا نام ''خلق حسن'' یا ''اچھا خلق'' ہو جاتا ہے۔

وہ اچھے کام جو خلق حسن کی وجہ سے بلا تکلف انجام پانے لگتے ہیں ''اخلاق حسنہ'' یا ''اچھے اخلاق'' کہلاتے ہیں' مثلاً بردباری' تحمل' صبر' برداشت' سخاوت' بہادری' انصاف' احسان اور دیگر وہ اُمور جو اخلاقی طور پر فضائل شمار ہوتے ہیں اور نفسِ انسانی کے کمالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اِسی طرح جب نفس انسانی کی صحیح تربیت نہ کی جائے اور اس میں پوشیدہ نیکی کی

---

۱) اسے اردو میں ''کردار'' بھی کہا جا سکتا ہے' یعنی ''اچھا کردار'' یا ''اعلیٰ کردار'' اور ''برا کردار''۔

صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی کوشش نہ کی جائے' اور اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے' یا اُس کی غلط تربیت کی جائے اور اس طرح وہ برائی کو پسند کرنے لگے اور بھلائی سے نفرت کرنے لگے اور اس سے ایسے اقوال و افعال بلا تکلف سرزد ہونے لگیں جو رَذائل و نقائص پر مشتمل ہیں تو اسے ''برا خلق'' کہا جائے گا۔ اور یہ برے افعال و اقوال ''اخلاق سیئہ'' یا ''برے اخلاق'' کہلائیں گے۔ مثلاً خیانت' جھوٹ' دھوکا' لالچ' بے مروّتی' درشتی' بدزبانی' بے حیائی وغیرہ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اچھے خلق کو اہمیت دی ہے اور مسلمانوں کی اخلاقی تربیت اور اعلیٰ کردار کو پروان چڑھانے کا حکم دیا ہے' حتیٰ کہ انسان کے ایمان و اسلام کے کمال کو بھی اخلاق و فضائل سے مربوط کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے نبی ﷺ کی تعریف یہ کہہ کر کی ہے کہ وہ اچھے اخلاق اور اعلیٰ کردار کے مالک ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ (القلم: ٤)

''(اے نبیؐ!) آپ یقیناً عظیم اخلاق پر کاربند ہیں۔''

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو اچھے اخلاق اختیار کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ (حٰمٓ السّجدۃ: ٣٤)

''اِس انداز سے جواب دیجئے جو بہترین ہے' تب وہ شخص جس کی آپ سے عداوت ہے' اس طرح ہو جائے گا گویا کہ وہ انتہائی گہرا دوست ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اچھے اخلاق کو حصولِ جنت کا ذریعہ بھی فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (آل عمران: ١٣٣'١٣٤)

''اور دوڑ کر چلو اپنے رب سے حاصل ہونے والی بخشش کی طرف اور اس جنت

کی طرف جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے' وہ اہلِ تقویٰ کے لئے تیار کی گئی ہے۔ جو خوشحالی اور تنگی (دونوں حالتوں میں) خرچ کرتے ہیں' اور جو غصہ پی جانے والے' لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔''

جناب رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا ایک اہم مقصد اخلاقِ حسنہ کو درجۂ کمال تک پہنچانا بھی تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) (۲)

''مجھے اس لئے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں شریفانہ اخلاق کو مکمل کردوں۔''

آنحضور ﷺ نے متعدد ارشاداتِ گرامی میں اخلاقِ حسنہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ مثلاً ایک فرمان ہے:

((مَا مِنْ شَیْءٍ فِی الْمِیْزَانِ اَثْقَلُ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ)) (۳)

''میزانِ اعمال میں حسنِ خلق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں۔''

نیز ارشاد ہے:

((اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ)) (۴)

''نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے۔''

اور فرمایا:

((اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ اَخْلَاقًا)) (۵)

''مؤمنوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہیں۔''

---

۲) الادب المفرد امام بخاریؒ۔ موطا امام مالکؒ' کتاب حسن الخلق میں "حسن الاخلاق" کا لفظ ہے۔ مسند احمد (ج ۲' ص ۳۸۱) میں "مکارمَ الاخلاق" کی جگہ "صالح الاخلاق" کا لفظ ہے۔ اور یہ حدیث صحیح ہے۔

۳) مسند احمد۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب فی حسن الخلق۔

٤) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تفسیر البر والاثم۔

۵) مسند احمد۔ وسنن ابی داؤد' کتاب السنة' باب الدلیل علی زیادة الایمان ونقصانه۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

((اِنَّ مِنْ اَحَبِّکُمْ اِلَیَّ وَاَقْرَبِکُمْ مِنِّیْ مَجْلِسًا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَحَاسِنُکُمْ اَخْلَاقًا)) (۶)

''تم میں سے مجھے سب سے پیارے وہ لوگ ہیں' اور قیامت کے دن مجھ سے قریب ترین نشست انہیں ملے گی جن کے اخلاق بہترین ہیں۔''

ایک بار آنحضرت ﷺ سے کسی نے سوال کیا کہ سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ تو ارشاد ہوا: ''حسن اخلاق''۔ اور سوال کیا گیا کہ سب سے زیادہ کس سبب سے لوگ جنت میں جائیں گے؟ ارشاد ہوا: ''تقویٰ اور اچھے اخلاق''۔ (۷) نیز ارشاد ہے:

((اِنَّ الْعَبْدَ لَیَبْلُغُ بِحُسْنِ خُلُقِہٖ عَظِیْمَ دَرَجَاتِ الْآخِرَۃِ وَشَرَفَ الْمَنَازِلِ وَاِنَّہٗ لَضَعِیْفُ الْعِبَادَۃِ)) (۸)

''بندہ اچھی عادات کی وجہ سے آخرت میں عظیم درجات اور معزز مقامات پر رسائی حاصل کر لے گا' حالانکہ اس کی عبادت معمولی درجے کی ہوگی۔''

حسن خلق کے متعلق سلف صالحین کے ارشادات

امام حسن بصریؒ نے فرمایا: ''حسنِ اخلاق کا مطلب ہے خندہ پیشانی' سخاوت اور دوسروں کو تکلیف دینے سے باز رہنا''۔ جناب عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا: ''حسن اخلاق نیک کاموں میں ہے' مثلاً حرام سے بچنا' حلال روزی تلاش کرنا' بیوی بچوں پر خرچ کرنے میں وسعت اختیار کرنا''۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں: ''حسنِ اخلاق کا یہ مطلب ہے کہ تو لوگوں سے قریب رہے اور ان کے درمیان اجنبی کی حیثیت سے رہے''۔ ایک اور صاحب فرماتے ہیں: ''حسن خلق کسی کو تکلیف نہ دینے اور مؤمن کی ناگوار باتوں کو برداشت کرنے کا نام ہے''۔ ایک اور بزرگ کا قول ہے: ''حسن خلق یہ ہے کہ تجھے صرف اللہ (کی رضا اور اس کے قرب) کی فکر ہو''۔ یہ تمام تعریفیں جزوی تعریفیں ہیں جو حسنِ خلق کے بعض اجزاء کو بیان کرتی ہیں۔ اس کی ذات اور حقیقت کو۔

---

۶) صحیح البخاری' کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ' باب مناقب عبد اللّٰہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

۷) جامع الترمذی' کتاب البر والصلۃ' باب ما جاء فی حسن الخلق۔ امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔

۸) طبرانی' ح ۷۵٤۔ اس حدیث کی سند جید ہے۔

واضح کرنے والی تعریف گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہیں۔

علمائے کرام نے اچھے اخلاق والے کی مندرجہ ذیل علامات بیان فرمائی ہیں:

''زیادہ حیا کرنے والا' کم تکلیف دینے والا' بہت اصلاح کرنے والا' سچ بولنے والا' باتیں کم اور عمل زیادہ کرنے والا' کم غلطیاں کرنے والا' فضول باتوں میں کم مشغول ہونے والا' نیکی کرنے والا' صلہ رحمی کرنے والا' باوقار' صابر' شاکر' بردبار' جسے سب پسند کریں' باوفا' پاک دامن' نہ لعن طعن کرنے والا' نہ گالی دینے والا' نہ لگائی بجھائی کرنے والا' نہ چغل خور' نہ جلد باز' نہ کینہ رکھنے والا' نہ حسد کرنے والا' نہ بخل کرنے والا۔ ہنس مکھ' اُس کی محبت اور عداوت سب اللہ کے لئے' رضامندی اور ناراضگی صرف اللہ کے لئے ہوتی ہے۔''

اس تعریف میں بھی اس کی بعض اوصاف کے ذریعے پہچان کرائی گئی ہے۔ آئندہ فصلوں میں ہم ایک ایک صفت کے متعلق تفصیل سے بیان کریں گے۔ اِن صفات سے متصف ہو کر ہی ایک انسان اچھے اخلاق والا بن سکتا ہے اور ان صفات کے مجموعہ کا نام ہی ''اخلاقِ حسنہ'' ہے۔

کتاب الاخلاق

دوسرا باب

صبر و تحمل

ایک مسلمان کو جن عمدہ اخلاق سے مزین ہونا چاہئے ان میں سے ایک صبر ہے' یعنی اللہ کی رضا کے لئے تکلیف برداشت کرنا۔ صبر کی تعریف یوں کی گئی ہے: ''نفس کو اس بات پر روک کر رکھنا جو اسے ناگوار ہو''۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے: ''ناپسندیدہ امر کو رضا اور تسلیم کے ساتھ برداشت کرنا۔''

مسلمان اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت پر روک کر رکھتا ہے اگرچہ نفس کو وہ اطاعت و عبادت ناگوار ہی ہو۔ وہ اپنے نفس سے اس پر عمل کروا کے رہتا ہے۔ اسی طرح وہ نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے روک کر رکھتا ہے اور اسے کسی گناہ

کے ارتکاب کی اجازت نہیں دیتا' خواہ نفس اپنی فطرت کی وجہ سے اُس گناہ کا کس قدر مشتاق ہو اور اس سے کتنا خوش ہو۔ اسی طرح جب کوئی مصیبت آ جائے تو مسلمان اپنے نفس کو جزع فزع اور تقدیر پر ناراض ہونے سے روک کر رکھتا ہے۔ اہل دانش فرماتے ہیں کہ فوت شدہ امر پر جزع فزع خود ایک آفت ہے اور آئندہ خطرہ سے گھبرا کر جزع فزع کرنا حماقت ہے۔ اور تقدیر پر ناراض ہونا دراصل اللہ تعالیٰ کو عتاب کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے مؤمن ہر حالت میں اس جزاء کو پیش نظر رکھتا ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت کرنے والوں سے کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو عظیم ثواب اور بے شمار اُخروی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں انہیں یاد رکھتا ہے۔ مؤمن اس سخت عذاب اور عظیم سزا کو فراموش نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں نافرمانوں کے لئے تیار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے سراسر عدل پر مبنی ہیں اور تقدیر ٹل نہیں سکتی۔ بندہ خواہ صبر کرے یا بے صبری کرے' اللہ کا فیصلہ بہر حال نافذ ہو کر رہتا ہے۔ البتہ اگر صبر کیا جائے تو ثواب بھی مل جائے گا اور اگر جزع فزع اور اللہ سے ناراضگی کا اظہار کرے تو تقدیر پھر بھی نہیں ٹلے گی' البتہ بندہ گناہ ضرور کما لے گا۔ چونکہ صبر کا وصف حاصل کرنے میں ریاضت اور مجاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے مسلمان فرد پہلے تو اللہ تعالیٰ سے یہ التجا کرتا ہے کہ اسے صبر عطا فرمائے' پھر اُن آیاتِ مبارکہ اور احادیث مقدسہ سے مدد لیتا ہے جن میں صبر کا حکم دیا گیا ہے اور اس پر اجر عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران: ۲۰۰)

''اے ایمان والو! صبر کرو' ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو' اور ثابت قدم رہو' اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

نیز فرمایا:

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ﴾ (البقرۃ: ۴۵)

''اور صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔''

نیز ارشاد ہے:

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ ..... ﴾ (النحل:۱۲۷)

''اور صبر کیجئے' اور آپ کا صبر بھی اللہ کی توفیق ہی سے ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (لقمان:۱۷)

''اور آپ کو جو مصیبت پہنچے اس پر صبر کیجئے' یہ کام یقیناً عزم والے کاموں میں سے ہے۔''

نیز فرمانِ خداوندی ہے:

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝﴾ (البقرة:۱۵۵۔۱۵۷)

''اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے' وہ لوگ کہ انہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹنا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے ربّ کی طرف سے عنایتیں ہیں اور رحمت ہے' اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''

علاوہ ازیں ارشاد ہے:

﴿وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (النحل:۹۶)

''اور ہم صبر کرنے والوں کو اُن کے بہترین اعمال کا بدلہ ضرور دیں گے۔''

اور فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ (السجدة:۲۴)

''اور ہم نے انہیں پیشوا بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے جب انہوں نے صبر کیا' اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔''

نیز ارشادِ خداوندی ہے:

﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر: ۱۰)
''صبر کرنے والوں کو تو بے حساب اجر دیا جائے گا۔''

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلصَّبْرُ ضِيَاءٌ)) (۱)
''صبر روشنی ہے۔''

نیز فرمایا:

((مَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ ، وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ ، وَمَنْ يَّتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ، وَمَا اُعْطِيَ اَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَاَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ)) (۲)
''جو گناہ سے بچتا ہے اللہ اسے پاک دامنی عنایت فرما دیتے ہیں، جو غنا کا طالب ہوتا ہے اللہ اسے غنی فرما دیتے ہیں، جو صبر اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے صبر دے دیتے ہیں اور کسی کو صبر سے بہتر اور زیادہ کشائش والا کوئی عطیہ نصیب نہیں ہوا۔''

اس کے علاوہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ ، اِنَّ اَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ ، اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ ، وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ)) (۳)
''مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کا ہر معاملہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اور یہ (خوبی) صرف مومن ہی کو حاصل ہے۔ اگر اسے خوشی (اور خوشحالی) نصیب ہوتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے، چنانچہ وہ اس کے لئے خیر ہو جاتی ہے، اور اگر اسے تنگی (اور مصیبت) پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے اور وہ (مصیبت بھی) اس کے لئے خیر (کا باعث) بن جاتی ہے۔''

آنحضور ﷺ کی بیٹی (حضرت زینب رضی اللہ عنہا) کا بچہ زندگی کی آخری

---

۱) صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب فضل الوضوء۔
۲) صحیح البخاری، کتاب الزکاة، باب الاستعفاف عن المسألة۔ وصحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب فضل التعفف والصبر۔
۳) صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب فی احادیث متفرقة۔

سانسیں لے رہا تھا' انہوں نے آنحضور ﷺ کو پیغام بھیجا کہ تشریف لائیے۔ حضور علیہ السلام نے پیغام لانے والے سے فرمایا:

((اِقْرَأْهَا السَّلَامَ وَقُلْ لَهَا : اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلَهُ مَا اَعْطٰى 'كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِاَجَلٍ مُسَمًّى' فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ))(۴)

''اسے میرا اسلام کہنا' اور کہنا کہ جو کچھ اللہ نے لے لیا وہ بھی اسی کا تھا اور جو کچھ وہ دیتا ہے وہ بھی اسی کا ہے' اس کے ہاں ہر چیز کی ایک مدت مقرر ہے۔ لہٰذا وہ صبر کرے اور اللہ سے ثواب کی امید رکھے۔''

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : اِذَا ابْتَلَيْتُ عَبْدِيْ بِحَبِيْبَتَيْهِ (عَيْنَيْهِ) فَصَبَرَ عَوَّضْتُهُ مِنْهُمَا الْجَنَّةَ))(۵)

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : جب میں بندے کو اس کی دو پیاری چیزیں (آنکھیں) لے کر آزماتا ہوں اور وہ صبر کرتا ہے تو میں ان کے بدلے اسے جنت دے دیتا ہوں۔''

حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُصِبْ مِنْهُ))(۶)

''اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔''

نیز ارشادِ نبویؐ ہے:

((اِنَّ عِظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ ' وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ ' فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ))(۷)

---

٤) صحيح البخاري' كتاب الجنائز' باب قول النبي ﷺ يعذب الميت ببعض بكائه عليه۔ وصحيح مسلم' كتاب الجنائز' ح ١١۔

٥) صحيح البخاري' كتاب المرضى' باب فضل من ذهب بصره۔

٦) صحيح البخاري' كتاب المرضى' باب ما جاء في كفارة مرض۔

٧) جامع الترمذي' كتاب الزهد' باب ما جاء في الصبر على البلاء۔ وسنن ابن ماجه' كتاب الفتن' باب الصبر على البلاء۔

''یقیناً بڑا بدلہ بڑی مصیبت کا ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت رکھتے ہیں تو انہیں آزمائش میں مبتلا فرما دیتے ہیں' پھر جو شخص راضی رہا اسے (اللہ کی) رضا حاصل ہوگئی' اور جو ناخوش ہوا اسے (اللہ کی) ناراضگی نصیب ہوئی۔''

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

((مَا يَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ فِيْ نَفْسِهٖ وَوَلَدِهٖ وَمَالِهٖ حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ وَمَا عَلَيْهِ خَطِيْئَةٌ)) (۸)

''مؤمن پر اس کی ذات میں' اس کی اولاد میں اور اس کے مال میں مصیبتیں آتی رہتی ہیں' حتیٰ کہ وہ اللہ سے اس طرح ملتا ہے کہ اس کا کوئی گناہ باقی نہیں ہوتا۔''

اذیت برداشت کرنا صبر میں شامل ہے' لیکن یہ ہے بہت دشوار۔ یہ صدیقین کا سامان اور صالحین کی علامت ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ مؤمن کو محض اللہ سے محبت رکھنے کی وجہ سے ستایا جائے اور وہ صبر کرے اور برداشت کرتا رہے۔ وہ برائی کے بدلہ میں بھلائی کرے' اپنی ذات کے لئے انتقام نہ لے' اور اپنی شخصیت مجروح ہونے سے متاثر نہ ہو' کیونکہ یہ مشکلات وہ اللہ کی راہ میں برداشت کر رہا ہے اور اس کے نتیجے میں اسے اللہ کی رضا حاصل ہونے کی امید ہے۔ اس معاملے میں انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی مثالیں اس کے پیش نظر رہتی ہیں۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسی شخصیت ہوگی جسے اللہ کی راہ میں تکلیفیں برداشت نہ کرنا پڑی ہوں اور اللہ تک پہنچنے کی کوشش میں اسے ابتلاء و محن کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: گویا وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے کسی نبی کا واقعہ بیان فرما رہے ہیں کہ ان کی قوم نے انہیں اس قدر پیٹا کہ لہولہان کر دیا۔ وہ پیغمبر علیہ السلام اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ)) ''اے اللہ! میری قوم کی مغفرت فرما دے' کیونکہ انہیں (اصل حقیقت کا) علم نہیں ہے۔'' (۹)

---

۸) جامع الترمذی' کتاب الزهد' باب ما جاء فی الصبر علی البلاء۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الفتن' باب الصبر علی البلاء (نحوه)

۹) صحیح البخاری' کتاب الانبیاء۔ آخری باب۔ وصحیح مسلم' کتاب الجهاد' باب غزوة احد

جناب رسول اللہ ﷺ کو بھی اسی قسم کی تکلیفیں برداشت کرنا پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ تکلیف کی ایک دوسری صورت بھی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دن کچھ مال تقسیم فرمایا۔ ایک بدوی آدمی نے کہا: اس تقسیم میں اللہ کی رضا مقصود نہیں تھی۔ آنحضور ﷺ کو خبر ملی تو چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا' لیکن اتنا فرما کر خاموش ہو گئے:

((يَرْحَمُ اللّٰهُ اَخِيْ مُوْسٰى لَقَدْ اُوْذِيَ بِاَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ))(۱۰)

''اللہ میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام پر رحمت فرمائے! انہیں اس سے بھی زیادہ اذیت پہنچائی گئی تھی اور انہوں نے صبر کیا تھا۔''

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے رسول اللہ ﷺ سے (مشرکین سے پہنچنے والی تکلیفوں کی) شکایت کی' اُس وقت آنحضرت ﷺ کعبہ کے سائے میں سر کے نیچے چادر رکھے ہوئے تشریف فرما تھے۔ ہم نے عرض کیا: ''کیا آپؐ ہمارے لئے اللہ سے مدد نہیں مانگیں گے؟ ہمارے لئے دعا نہیں فرمائیں گے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((قَدْ كَانَ مَنْ قَبْلَكُمْ يُؤْخَذُ الرَّجُلُ فَيُحْفَرُ لَهُ فِي الْاَرْضِ فَيُجْعَلُ فِيْهَا ثُمَّ يُؤْتٰى بِالْمِنْشَارِ فَيُوْضَعُ عَلٰى رَاْسِهٖ فَيُجْعَلُ نِصْفَيْنِ ' وَيُمْشَطُ بِاَمْشَاطِ الْحَدِيْدِ مَا دُوْنَ لَحْمِهٖ وَعَظْمِهٖ مَا يَصُدُّهٗ ذٰلِكَ عَنْ دِيْنِ اللّٰهِ))(۱۱)

''تم سے پہلے لوگوں کی یہ حالت تھی کہ ایک آدمی کو پکڑ لیا جاتا اور زمین میں گڑھا کھود کر اسے (کمر تک اس میں) دبا دیا جاتا' پھر اس کے سر پر آرا رکھ کر اسے چیر کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ یا لوہے کی کنگھیوں سے اس کی ہڈیوں سے گوشت الگ کر دیا جاتا' لیکن یہ سب مشکلات اسے دین سے پھیر نہیں سکتی تھیں۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں پیغمبروں کے واقعات بیان فرمائے ہیں کہ وہ تکلیفیں برداشت کرتے تھے اور کہتے تھے:

---

۱۰) صحیح البخاری' کتاب الانبیاء' باب بعد ما حدیث الخضر مع موسیٰ۔ وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب اعطاء المولفة ومن یخاف علی ایمانه ان لم یعط ..... (بالمعنی)

۱۱) صحیح البخاری' کتاب الاکراہ' باب من اختار الضرب والقتل والهوان علی الکفر۔

﴿وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ﴾ (ابرھیم:۱۲)

''اور ہم کیوں نہ اللہ پر توکل کریں' اس نے ہمیں (ہدایت کی) راہیں دکھادی ہیں' تم ہمیں جو تکلیفیں دیتے ہو ہم اس پر ضرور صبر کریں گے۔ اور بھروسا کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔''

جناب عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: ''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا: آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت' لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا' بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتا لینا چاہے تو تُو اپنا چوغہ بھی اسے لینے دے۔''(۱۲)

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے: ''ہم ایک شخص کے ایمان کو (صحیح) ایمان نہیں سمجھتے تھے جب تک وہ تکلیف پر صبر کرنے والا نہ ہوتا۔''

صبر و تحمل کی ان زندہ مثالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمان کا کردار صبر و برداشت کا مظہر ہوتا ہے اور وہ اس سے محض ثواب کا طالب ہوتا ہے' وہ نہ شکوہ کرتا ہے' نہ ناراضگی کا اظہار کرتا ہے' نہ برائی کا جواب برائی سے دیتا ہے' بلکہ برائی کے جواب میں نیکی کرتا ہے اور صبر سے کام لیتے ہوئے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (الشوریٰ:۴۳)

''اور جو صبر کرے اور بخش دے تو یہ بڑے عزم (و ہمت) کا کام ہے۔''

☆☆☆

۱۲) احیاء العلوم' غزالیؒ منقول از انجیل متی' باب ۵' فقرہ ۳۸۔۴۰

ہمارا دینی و تحریکی فکر

اور اس کے تقاضے

اور

امریکی معاشرہ میں دعوت و اقامتِ دین

کے کام کی ممکنہ عملی صورت ☆

از بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

پس نوشت..... جولائی ۲۰۰۳ء

کئی سال سے تنظیم اسلامی شمالی امریکہ کے رفقاء کے مابین ایک بحث چل رہی تھی کہ آیا اس کا تعلق مرکزی تنظیم اسلامی کے ساتھ' جس کا دفتر پاکستان میں ہے' حسبِ سابق قائم رکھا جائے یا اسے ایک آزاد یا کم از کم نیم خودمختار (Autonomous) تنظیم کی حیثیت دے دی جائے —— اس بحث کا اصل محرک میں خود ہی تھا۔ اس لئے کہ میں محسوس کرتا تھا کہ ذرائع رسل و رسائل کی تمام تر ترقیوں کے باوجود پاکستان سے T.I.N.A. کے امور کی نگرانی ممکن نہیں ہے —— دوسرے یہ کہ امریکن خواہ مقامی ہوں خواہ ''مہاجر'' ہوں' اسے ایک پاکستانی تنظیم سمجھتے ہیں' جس سے اس کا حلقہ محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس کی دعوت مقامی امریکنوں اور عرب مہاجروں تک نہیں پہنچ رہی۔

☆ مکمل مضمون کے لئے ملاحظہ فرمائیں میثاق' فروری ۲۰۰۳ء

مزید برآں میرے سالانہ اسفار کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بعض رفقاء یہ سمجھنے لگے ہیں کہ توسیع دعوت تو صرف میرا ہی کام ہے ——— ان کا کام تو بس اجتماعات کی حاضری وغیرہ کی خانہ پری کرنا ہے——— بنابریں میری خواہش تھی کہ اس ضمن میں آخری فیصلہ کر ہی لیا جائے ——— لیکن ہر بار سالانہ اجتماع میں رفقاء کی غالباً مجھ سے ذاتی محبت اور تعلق خاطر کے باعث غالب اکثریت کے ساتھ فیصلہ برعکس گویا STATUS QUO برقرار رکھنے کے حق میں ہوتا رہا اور مجھے خاموش ہونا پڑا۔

اب ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے افسوس ناک واقعے کے بعد میری امریکہ آمد و رفت کا مسئلہ بھی مشکل بلکہ شاید ناممکن ہوگیا ہے۔ (میرا چار سالہ ویزا گزشتہ سال جون جولائی میں ختم ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں نے ویزا کے لئے درخواست جولائی میں داخل کر دی تھی۔ لیکن پورے آٹھ ماہ تک اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے اپنا پاسپورٹ واپس منگوالیا' اس لئے کہ مجھے بنگلہ دیش جانے کے لئے وہاں کا ویزا لینا تھا۔ البتہ یہ غنیمت ہے کہ اس پر REJECTION کی مہر نہیں لگی!) ادھر تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ میں اس امر پر بحث ہوئی تو اس نے بالاتفاق یہ طے کر دیا کہ اس مسئلے کا TINA کے سینئر حضرات سے مشورہ کرنے کے بعد میں خود ہی کوئی آخری فیصلہ کرلوں' جو ۳۰ر جون سے قبل ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب رفقاءِ تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ کی بیعت میرے نامزد کردہ امیر برادرم مصطفیٰ الترک کے ہاتھ پر ہوگی۔ اگرچہ خود ان کی بیعت عالمی تنظیم اسلامی کے نئے امیر حافظ عاکف سعید صاحب کے ساتھ رہے گی!——— تو اگرچہ اس پر T.I.N.A. کے بعض محترم رفقاء کے کچھ تحفظات بھی میرے علم میں آئے' تاہم میرا حتمی فیصلہ یہی ہے ——— البتہ مستقبل میں حالات کی کسی تبدیلی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں آگے کی جانب مزید پیش رفت ——— یا واپس پسپائی کی کوئی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ اس ضمن میں میرا آخری اور قطعی فیصلہ جس پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے' حسب ذیل ہے:

احمدہ واصلّی علیٰ رسولہ الکریم

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی (وقلمی) یفقھوا قولی

اللھم الھمنی رشدی واعذنی من شرور نفسی ۔ آمین!

امّا بعد!

میں اللہ پر توکّل اور اس کی نصرت و تائید کے بھروسے پر تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ (ٹینا) کے ضمن میں حسب ذیل فیصلوں کا اعلان کرتا ہوں!

۱) ''ٹینا'' کا نصب العین، مقاصد اور نہج حسبِ سابق ہی رہیں گے۔

۲) اس کی ہیئت تنظیمی بھی حسبِ سابق ''بیعت سمع و طاعت (فی المعروف)'' کی منصوص، مسنون اور ماثور اساس پر قائم رہے گی۔

۳) لیکن آئندہ یہ بیعت امیر ٹینا ہی کے ہاتھ پر ہوگی۔

۴) میں نے کچھ عرصہ قبل امیر ٹینا کی حیثیت سے برادرم مصطفیٰ الترک کو دو سال کے لئے نامزد کیا تھا۔ اس کے بعد وہ لاہور آئے اور ان سے گفتگو اور تبادلہ خیال کے بعد مجھے اپنے فیصلے پر مزید انشراح و اطمینان حاصل ہوا۔ اب میں انہیں تاحیات امیر ''ٹینا'' کی حیثیت سے نامزد کرتا ہوں۔ چنانچہ یکم جولائی ۲۰۰۳ء کے بعد صرف وہ رفقاء تنظیم میں شامل رہیں گے/ ہوں گے جو برادرم مصطفیٰ الترک سے بیعت کرلیں!

۵) البتہ انہوں نے لاہور میں جو بیعت موجودہ امیر تنظیم اسلامی عزیزم حافظ عاکف سعید صاحب سے کی تھی وہ برقرار رہے گی اور یہی واحد تعلق عالمی تنظیم اسلامی کے مرکز واقع لاہور (پاکستان) اور ''ٹینا'' کے مابین رہے گا۔

۶) امید ہے کہ برادرم مصطفیٰ الترک اس بیعت کے تقاضوں کو کماحقہا ادا کریں گے، جس کا ایک مظہر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر ''ٹینا'' کے رفقاء یہ شکایت کریں کہ ان کا

امیر تنظیم کے فکر یا منہج سے انحراف کر رہا ہے یا وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی معصیت کا حکم دے رہا ہے اور امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید کو یہ شکایات درست معلوم ہوں تو وہ انہیں معزول کر کے رفقاء کے مشورے سے کسی دوسرے شخص کو امیر ''بنا'' نامزد کر سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا فرداً فرداً اور تنظیم اسلامی کا بحیثیت جماعت حامی و ناصر ہو۔ آمین ... یارب العالمین!

المحتاج الیٰ مغفرۃ الرب ورحمتہ

(ڈاکٹر اسرار احمد)
داعی و بانیٔ تنظیم اسلامی

توثیق از مرکزی مجلس عاملہ
و امیر تنظیم اسلامی — دستخط حافظ عاکف سعید

داعی و مؤسس تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد**

ختم نبوت کے دو مفہوم
اور
تکمیل رسالت کے عملی تقاضے

کل صفحات 48 ' قیمت 12 روپے

ملنے کا پتہ: قرآن اکیڈمی 36- کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون 03-5869501

دنیائے اسلام

المَملکۃُ الاُردنیّۃُ الھَاشمیّۃ

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

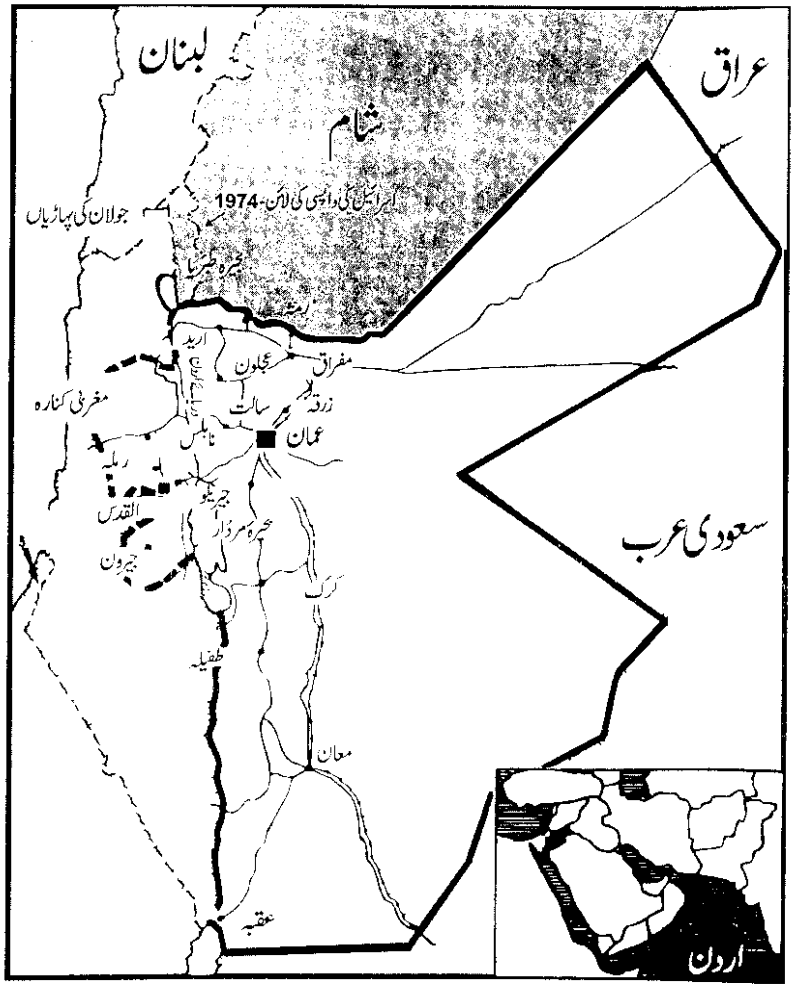

اُردن: ایک نظر میں

سرکاری نام: المملکة الأردنیة الهاشمیة
حکمران: شاہ عبداللہ ثانی (۱۹۹۹ء)
وزیراعظم: علی ابوالراغب (۲۰۰۰ء)
رقبہ: ۳۵ ہزار ۶۳۷ مربع میل (۹۲ ہزار ۳۰۰ مربع کلومیٹر) اس میں اسرائیل کا مقبوضہ علاقہ مغربی کنارہ شامل نہیں ہے۔
سرحد: ۷۷۰ کلومیٹر
آبادی: تقریباً ۵۳ لاکھ
سالانہ شرح افزائش: ۲.۲ فیصد
شرح پیدائش: ۲۴.۶ فی ہزار
شرح اموات اطفال: ۱۹.۶ فی ہزار
گنجانی آبادی: ۱۴۹ فی مربع میل
دارالحکومت: عمان (آبادی نو لاکھ ۶۳ ہزار)
بڑے بڑے شہر: زرقا (چار لاکھ)، اربد (دو لاکھ)، السلط (پونے دو لاکھ)
زر کی اکائی: اُردنی دینار (۱۰۰۰ فلس)
زبانیں: عربی (سرکاری)، انگریزی
نسلیں: عرب ۹۸ فیصد، سرکیشیائی ایک فیصد، آرمینی ایک فیصد
مذاہب: اسلام ۹۲ فیصد، عیسائی ۶ فیصد
شرح خواندگی: ۸۶ فیصد
کل سالانہ آمدنی: ۱۷.۳ ارب ڈالر
فی کس سالانہ آمدنی: ۳۵۰۰ ڈالر
شرح افزائش: ۲ فیصد
افراطِ زر: ۷.۰ فیصد
قابل کاشت رقبہ: ۴ فیصد
زراعت: گندم، جو، زیتون، کیلا، انگور، ٹماٹر، تربوز، بھیڑ، بکریاں، پولٹری
صنعت وحرفت: پلاسٹک، سیمنٹ، سوتی کپڑا، غذائی اشیاء، تیل کی صفائی، پوٹاش، فاسفیٹ، بجلی کا سامان، سیاحت
معدنیات: پوٹاش، فاسفیٹ، تیل
اہل محنت: کل تعداد پندرہ لاکھ
صنعت وحرفت: ۱۱.۴ فیصد
کامرس، ہوٹل، ریستوران: ۱۰.۵ فیصد
تعمیرات ۱۰ فیصد
ٹرانسپورٹ ومواصلات ۸.۷ فیصد
زراعت: ۷.۴ فیصد، دیگر خدمات ۵۲ فیصد
برآمدات: ۲ ارب ڈالر:
فاسفیٹ، کھاد، مصنوعات، پوٹاش
درآمدات: ۴ ارب ڈالر:
کچا تیل، مشینری، ٹرانسپورٹ، خوراک، مویشی، مصنوعات
تجارتی ساتھی: بھارت، عراق، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، یورپی یونین، انڈونیشیا، لبنان، کویت، شام، ایتھوپیا، جرمنی، امریکہ، جاپان، برطانیہ، اٹلی، ترکی، ملائشیا، چین
حدودِ اربعہ: شمال میں شام،
شمال مشرق میں عراق،
مشرق اور جنوب میں سعودی عرب
اور مغرب میں اسرائیل ہے۔

غالباً دنیا میں تین ہی قطعاتِ ارضی ایسے ہیں جو اپنے اپنے قدیم دریاؤں کے ناموں سے منسوب ہیں۔ ایک سندھ، دوسرا پنجاب اور تیسرا اُردن۔ دریائے اُردن کو یوں تو دریا کہا جاتا ہے اور واقعی وہ اِس علاقے میں سب سے بڑا دریا ہے، لیکن ہمارے ہاں کی اوسط درجے کی نہریں بھی اس سے زیادہ چوڑی ہوتی ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب دریا ہے جو شمال میں کوہستان لبنان سے نکل کر تقریباً دو سو میل جنوب کی طرف جا کر بحیرۂ لوط میں گرتا ہے۔ بحیرۂ لوط خود بحرِ مُردار☆ کا حصہ ہے۔

۱۹۴۸ء تک دریائے اُردن کے مشرقی حصے کو شرقِ اُردن اور مغربی حصے کو فلسطین کہا جاتا تھا، لیکن اب عملاً فلسطین کے نام سے کوئی خطۂ زمین دنیا کے نقشے پر موجود نہیں ہے۔ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ نے امریکہ کے ساتھ مل کر فلسطین کو اس سازشی ترکیب سے تقسیم کیا کہ اس کا مغربی حصہ (جو بحر روم کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے اور نہایت ہی سرسبز و شاداب اور قدرتی مناظر سے بھرا ہوا ہے) یہودیوں کے حوالے کیا اور مشرق کی طرف کا کچھ حصہ عربوں کے لئے رہنے دیا۔ ۱۹۴۹ء میں شاہ عبداللہ نے فلسطین کے

☆ یہ چھوٹا سا سمندر کل ۵۰ میل لمبا اور ۱۱ میل چوڑا ہے، اس کی سطح کا کل رقبہ ۳۵۱ مربع میل ہے۔ زیادہ سے زیادہ گہرائی ۱۳۰۰ فٹ ہے۔ اس کی جغرافیائی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کسی بڑے سمندر سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ (مصری محقق عبدالوہاب النجار کی یہ رائے کہ ''یہ سمندر پیدا ہی اس طرح ہوا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا، ان کی بستیاں الٹی گئیں تو یہاں سمندر کا پانی نکل آیا'' اس لحاظ سے بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ اس سمندر کا کوئی رابطہ کسی سمندر سے نہیں ہے، اس لئے کوئی غیر معمولی واقعہ ہی اس سمندر کے ظہور کا سبب بن سکتا ہے۔ قصص الانبیاء، لعبدالوہاب النجار، ص ۱۱۳) اپنے طول و عرض کے لحاظ سے اس کو ایک ''جھیل'' کہنا زیادہ موزوں ہوگا، لیکن چونکہ اس کا پانی خالص سمندری پانی ہے، بلکہ اس کی نمکیات اور کیمیاوی اجزا عام سمندروں سے زیادہ ہیں لئے اس کو ''بحر'' یا ''بحیرہ'' کہا جاتا ہے۔

اس سمندر کی دوسری جغرافیائی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام سطح سمندر سے تیرہ سو فٹ نیچے ہے، یہاں سے قریب ترین سمندر بحر متوسط (یا بحر روم) کی خلیج عقبہ ہے، لیکن بحر مردار اس کی سطح سے ۱۳۰۰ فٹ نیچے واقع ہے، اور اس طرح یہ کرۂ زمین کا سب سے نچلا حصہ ہے۔ دریائے اُردن اسی سمندر میں آ کر گرتا ہے، اور آس پاس کی پہاڑی ندیاں بھی اس میں آ کر شامل ہوتی ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

مغربی حصے کو باقاعدہ اپنی مملکت میں شامل کرلیا اور اسی کی وجہ سے انہوں نے اپنی مملکت کو شرق اُردن کی بجائے ''المَملكة الأرُدنيةُ الهاشمية'' کا نام دیا' اور یہ حصہ اب ان کے نقشے میں فلسطین کے نام سے نہیں' بلکہ 'ضَفَّہ غربیہ' (دریائے اُردن کا مغربی کنارہ) کے نام سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ فلسطین کا کچھ حصہ (غزہ کی پٹی) جو جزیرہ نما سینا سے متصل ہے' مصر کے قبضے میں رہا' لیکن جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد فلسطین کا سارا علاقہ اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا' اور اب تک اسی کے قبضے میں ہے۔

گہوارۂ مذاہب

اُردن ایک ایسی اہم تاریخی سرزمین پر واقع ہے جسے ''گہوارۂ مذاہب'' ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں اپنے لئے ایک علیحدہ سلطنت قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو اُس وقت دریائے اُردن کی وادی میں بسنیوں' اموریوں' موابیوں' ادومیوں اور عمونیوں کی چھوٹی چھوٹی خودمختار سلطنتیں قائم تھیں۔ بنی اسرائیل نے بسنیوں اور اموریوں پر توبآسانی فتح حاصل کرلی' لیکن وہ ادومیوں' موابیوں اور عمونیوں کو شکست نہ دے سکے۔ بہرصورت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مزار کوہ عباریم کی چوٹی پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی اریحا (جریکو) کے مقابل دریائے اُردن کے مشرقی کنارے پر ہے۔ اسی چوٹی پر چڑھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ملک کنعان کو دیکھا تھا۔ حضرت موسیٰ کے بھائی حضرت ہارون' حضرت یعقوب' حضرت یوسف' حضرت ابراہیم' حضرت اسحاق (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اور حضرت سارہ کے مزارات بھی اسی سرزمین میں ہیں اور حضرت معاذ بن جبل' حضرت ابوعبیدہ بن الجراح' حضرت شرحبیل☆ بن حسنہ اور حضرت ضرار بن ازور رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابۂ رسولؐ کے مقابر بھی اسی گہوارۂ مذاہب میں مامون و محفوظ ہیں۔ حتیٰ کہ مسلمانانِ عالم کا قبلۂ اوّل بیت المقدس بھی اس سرزمین کو شرفِ عظیم عطا کئے ہوئے ہے۔

☆ شُرَحْبِیل: شین پر پیش' را پر زبر' حاء ساکن اور با مکسور ہے۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی ان کا نام ''شرجیل'' (جیم سے) لیتے ہیں' جو بالکل غلط ہے۔

یونان و روم کے عہد میں

آٹھویں صدی قبل مسیح میں یہ علاقہ اشوریوں کے قبضے میں آ گیا۔ ۶۰۰ ق م میں سلطنت اشوریہ کے زوال کے بعد نبطیوں کے قبضے میں آ گیا (نبطی ایک عرب قبیلہ ہے)۔ ان کی حکومت ۱۰۶ء تک قائم رہی۔ اس سال روم کے شہنشاہ ٹروجن نے انہیں میدان جنگ میں شکست فاش دی۔ اس سے بہت پہلے سکندر اعظم نے بھی اُن پر حملہ کر کے ان کا کچھ علاقہ ہتھیا لیا تھا اور وہاں یونانی بستیاں آباد کی تھیں۔ لیکن سکندر اعظم کے بعد یونانیوں اور نبطیوں میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔ وہ باہمی امن کے ساتھ رہتے رہے۔ ۱۰۶ء میں جب رومیوں نے بطرہ کو فتح کیا تو یونانی بستیاں بھی ان کے زیر تسلط آ گئیں۔

پانچویں صدی میں یہ علاقہ روم کی بازنطینی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ پھر چھٹی صدی عیسوی میں مسلسل پچاس سال تک انتشار اور خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی، جس میں بازنطینی، ایرانی، یونانی اور نبطی قبائل باہم دست و گریباں رہتے تھے۔

اسلام کی آغوش میں

ساتویں صدی میں یہ سرزمین اسلام کی آغوش میں آ گئی اور آج تک اسلام کے زیر سایہ ہے۔ اگرچہ اس کے کچھ حصے پر اسرائیل کا ناجائز قبضہ ہے، لیکن اس کی بازیابی کی جنگ جاری ہے۔ ۶۳۶ء میں تیس ہزار اسلامی فوج نے دریائے یرموک کے کنارے بازنطینی سلطنت کے شہنشاہ ہرقل کے اڑھائی لاکھ کے لشکر جرار کو شکست دی تو یہ خانہ جنگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور امن و امان کا دور دورہ شروع ہوا۔ یہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت تھا۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے ۱۴ ہجری/۶۳۶ عیسوی میں پورے اُردن کو فتح کر لیا تھا۔ چند شہر بعد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فتح کئے تھے۔ اس زمانے سے یہ علاقہ عربوں کے صوبہ اُردن کی حیثیت سے مشہور رہا۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں اُردن کا سالانہ خراج ایک لاکھ دینار کے قریب تھا۔

☆ اس کا صحیح تلفظ دِمَشْق (دال کی زیر، میم کی زبر اور شین کے جزم کے ساتھ ہے)۔

۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے سلطنت یروشلم قائم کر کے اُردن کو اس کا حصہ بنا لیا اور مشرقی (شرق) اُردن کو اپنی آخری دفاعی لائن قرار دیا۔

۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کو شکست دی اور شام اور اُردن سلطان ایوبی اور ان کے جانشینوں کے زیر نگین آ گئے۔ انہوں نے اُردن کو ایک جداگانہ اور متصل سلطنت کی حیثیت دے دی۔ چنانچہ اس دور کا اُردن مرج سے عکہ' صور اور صیدا تک کے شہروں پر مشتمل تھا۔ جداگانہ اور مستقل حیثیت سے پہلے اُردن بھی لبنان کی طرح شام ہی کا ایک حصہ تھا۔ صلیبی جنگوں کے آثار اب تک لبنان میں محفوظ ہیں۔ عمان سے ۷۸ میل جنوب میں کرک کے مقام پر جلبیوں کا قلعہ اور عجلون کے چار ہزار فٹ بلند مقام پر عربوں کا بنایا ہوا قلعہ اب تک جوں کا توں موجود ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد

۱۵۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک اُردن خلافتِ عثمانیہ کا ایک حصہ رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اُردن پر فرانس کا قبضہ ہو گیا اور فرانس نے اسے مملکت شام کا ایک صوبہ بنا دیا۔ ۱۹۰۸ء میں عثمانی ترکوں نے حجاز ریلوے مکمل کی جو ۱۹۰۰ء سے بن رہی تھی۔ حجاز ریلوے کے باعث دِمَشق ☆ کو مدینے سے ملا دیا گیا اور یوں اُردن کا بھی بیرونی دنیا سے تعلق قائم ہوا اور اس نے جنگی نقطہ نظر سے بھی اہمیت اختیار کر لی۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ـ۱۹۱۸ء) کے دوران میں اُردن نے غیر معمولی ڈرامائی حیثیت اختیار کر لی۔ برطانیہ کا جاسوس کرنل ٹی ای لارنس اور شریف مکہ کا بیٹا فیصل اس ڈرامے میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتے تھے۔ خلافتِ عثمانیہ کے خلاف عربوں کی بغاوت ۱۹۱۶ء میں شروع ہوئی جس کے قائد شریفِ مکہ شاہ حسین تھے۔ شاہ حسین کے تیسرے بیٹے امیر فیصل کی سرکردگی میں عرب افواج نے دِمشق فتح کر لیا اور ۱۹۱۸ء میں شام میں اپنی عرب حکومت قائم کر دی' لیکن جنگ عظیم کی فاتح اقوام برطانیہ اور فرانس نے باہم ایک خفیہ معاہدہ کیا' جس کی رُو سے طے پایا کہ بحیرۂ روم کے مشرق میں واقع تمام عرب علاقہ' جو خلافت عثمانیہ کے پاس تھا' دونوں طاقتوں کے درمیان تقسیم کر لیا

جائے گا اور دریائے اُردن کا مشرقی علاقہ برطانیہ کے زیر اثر آئے گا۔

چنانچہ مئی ۱۹۲۰ء میں سان ریمو کانفرنس ہوئی، جس کے فیصلے کے تحت فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب کر دیا گیا اور شام کو فرانس کے زیر اثر۔ چنانچہ جولائی میں فرانس نے امیر فیصل کو شام سے نکال دیا۔ دسمبر میں برطانیہ اور فرانس نے ایک اور معاہدہ کر کے شرق اُردن کو بھی برطانیہ کے زیر انتداب کر دیا۔ اس معاہدے پر عمل درآمد کے لئے قاہرہ میں ایک کانفرنس ہوئی، جس میں چرچل، کرنل ٹی ای لارنس اور امیر عبداللہ (شریفِ مکہ، شاہ حسین کا دوسرا بیٹا) شریک ہوئے۔ امیر فیصل کو عراق کا اور امیر عبداللہ کو شرق اُردن کا حکمران بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا جو پہلے ہی اُردن پر قابض تھا۔ برطانیہ نے شریفِ مکہ اور ان کی اولاد کی ''دل جوئی'' کی خاطر انہیں اُردن میں برقرار رکھا۔

عبداللہ بن حسین کا عہد (۱۹۲۱ء۔۱۹۵۱ء)

امیر عبداللہ حجاز کے شریف، شاہ حسین کے دوسرے فرزند تھے۔ وہ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور استنبول (ترکی) میں تعلیم پائی۔ وہ عثمانی پارلیمنٹ میں مکہ سے رکن منتخب ہوئے تھے۔ جب عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تو انہوں نے اس جنگ میں عربوں کی طرف سے نمایاں حصہ لیا۔

امیر عبداللہ پر لے درجے کے انگریز نواز تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُردن کا علاقہ انگریزوں کے زیر اثر تھا۔ امیر عبداللہ سارا انتظام انگریز مشیروں کی مدد سے انجام دیتے تھے، حتیٰ کہ اُردنی فوج کی تنظیم بھی ایک انگریز جنرل گلب پاشا نے کی اور یہ فوج ''عرب لیجن'' کہلائی۔ عرب لیجن اپنی اعلیٰ تربیت و تنظیم کی وجہ سے دوسری عالمی جنگ کے خاتمے تک تمام عرب ممالک کی فوجوں پر برتری رکھتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اُردن کا بیشتر حصہ ریگستانی ہے اور آمدنی کے وسائل کم ہیں۔ برطانیہ نے اُردن کے اخراجات پورے کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کچھ تو امیر عبداللہ کی خصوصی انگریز نواز خدمات کے صلے میں اور کچھ اُردن کے دباؤ کی وجہ سے برطانیہ نے اُردن کو رفتہ رفتہ اختیارات دینے شروع کئے۔ چنانچہ:

۱۹۲۱ء۔ برطانیہ نے باضابطہ طور پر امیر عبداللہ کو شرقِ اردن کا حکمران تسلیم کرلیا اور یوں ہاشمی خاندان کی موجودہ حکومت قائم ہوئی۔

۱۹۲۸ء۔ برطانیہ نے شرق اُردن کو آزاد مملکت کے طور پر تسلیم کرلیا' لیکن خارجہ پالیسی' دفاع اور مالیات اپنے پاس رکھے۔

۱۹۲۹ء۔ پہلی قانون ساز کونسل قائم ہوئی۔

۱۹۳۴ء۔ عرب ممالک میں اُردن کے سفارت خانے قائم ہوئے۔

۱۹۴۵ء۔ اُردن عرب لیگ کا رکن بن گیا۔

۱۹۴۶ء۔ ۲۲ رمارچ کو برطانیہ نے اُردن کو مکمل آزادی اور خود مختاری دے دی۔ امیر عبداللہ نے ۲۵ مئی کو اپنے لئے امیر کی بجائے بادشاہ کا لقب اختیار کرلیا۔ اس طرح اُردن ''امارت'' سے ترقی کر کے ''بادشاہت'' میں تبدیل ہوگیا۔ برطانیہ نے دفاعی تحفظ اور مالی امداد کی ذمہ داری قبول کرلی۔

شاہ عبداللہ برطانیہ کے زیر اثر ہی نہیں' بلکہ برطانیہ نواز تھے' اس لئے ان کی پالیسیاں عام طور پر دوسرے عرب ممالک کے خلاف ہوتی تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب اقوام متحدہ نے فلسطین کو تقسیم کیا تو عبداللہ واحد حکمران تھے جنہوں نے اس تقسیم کو منظور کیا' لیکن جب بعض عرب ممالک نے برطانوی فوجوں کی فلسطین سے واپسی (۱۹۴۸ء) کے بعد فلسطین کو یہودیوں کے تسلط میں جانے سے روکنے کے لئے نئی مملکت اسرائیل سے جنگ کی تو شاہ عبداللہ نے اس جنگ میں شرکت کی اور ''عرب لیجن'' کی منظم فوج کی مدد سے مسجد اقصیٰ' گنبد صخرا' بیت المقدس اور یروشلم کے دوسرے مقدس مقامات کے علاوہ فلسطین کے وسطی حصے پر قبضہ کرلیا' جبکہ شام اور مصر کی فوجیں یہودیوں کے مقابلے میں ناکام رہیں۔

اُس وقت تک عبداللہ کی مملکت کا نام شرقِ اُردن تھا' کیونکہ یہ علاقہ دریائے اُردن کے مشرق میں واقع تھا۔ یروشلم اور فلسطین کے وسطی حصے پر قبضے کے بعد نئی وسیع تر مملکت کا نام ۲۶ راپریل ۱۹۴۹ء کو شرقِ اُردن سے بدل کر ''المملكة الأردنية

الھاشمیۃ" کر دیا گیا جو عرفِ عام میں ''اُردن'' (Jordan) کہلایا۔

فلسطین سے متعلق سعودی عرب، شام اور مصر کا موقف یہ تھا کہ فلسطین کو ایک علیحدہ اور مستقل ریاست ہونا چاہئے، جس کے سربراہ عظیم فلسطینی رہنما مفتی امین الحسینی ہوں، لیکن شاہ عبداللہ نے اس موقف کے خلاف ۱۹۵۰ء میں عرب فلسطین کے مقبوضہ علاقے (مغربی کنارے یا ویسٹ بینک) کا باضابطہ الحاق اُردن سے کر دیا۔ فلسطینیوں کو وزارت اور پارلیمنٹ میں بھی نمائندگی دی گئی۔ اس طرح آزاد فلسطین کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا (جو اَب امریکہ کا ''روڈ میپ'' آنے کے بعد پورا ہونے کا امکان رکھتا ہے)

فلسطین کی پہلی جنگ میں ناکامی اور وہاں کے بیشتر حصے پر اسرائیل کا قبضہ ہو جانے کے بعد لاکھوں کی تعداد میں فلسطینی بے گھر ہو گئے اور مہاجرین نے زیادہ تر اُردن ہی میں پناہ لی۔ اُردن کی مختصر حکومت کو، جس کے وسائل پہلے ہی کم تھے، مہاجرین کی آبادکاری کے مسئلے نے ایک نئی مشکل سے دوچار کر دیا۔ آئینی حکومت اور جمہوریت کے عوامی مطالبات نے بھی زور پکڑا۔ شاہ عبداللہ کی مطلق العنانی اور آمریت کی پالیسی نے بھی عام بے چینی پیدا کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰ر جولائی ۱۹۵۱ء کو ایک فلسطینی نوجوان نے شاہ عبداللہ کو، جبکہ وہ مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے گئے تھے، گولی مار کر قتل کر دیا۔

حسین بن طلال کا عہدِ حکومت

شاہ عبداللہ کے بعد اُن کے سب سے بڑے لڑکے طلال کو ۵ر ستمبر ۱۹۵۱ء کو شاہِ اُردن قرار دے دیا گیا، لیکن اُردن کی پارلیمنٹ نے ان کے دماغ میں خلل ہونے کی وجہ سے ان کو معزول کر دیا اور ۱۱ر مئی ۱۹۵۲ء کو طلال کے بیٹے حسین کو بادشاہ بنا دیا۔

شاہ حسین ۱۹۳۵ء میں عمان میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہاں کے مشہور فوجی کالج سینڈھرسٹ میں فوجی تربیت حاصل کی۔ وہ جب بادشاہ ہوئے تو ان کی عمر صرف سترہ سال تھی، لیکن انہوں نے پورے ملک کے

نئے اور پیچیدہ مسائل کا بڑی جرأت اور کامیابی سے مقابلہ کیا۔ ۱۹۵۶ء میں جب نہر سویز کے مسئلے پر برطانیہ نے مصر کے خلاف جارحانہ کارروائی کی تو شاہ حسین نے اُردن کی فوج کے انگریز کمانڈر جنرل گلب پاشا کو علیحدہ کر دیا' اور برطانیہ سے کیا ہوا وہ پرانا معاہدہ بھی ختم کر دیا جس کے تحت اُردن کو سالانہ امداد ملتی تھی۔ اس معاہدے کی تنسیخ سے اُردن کو مالی نقصان ضرور ہوا لیکن اُردن پر سے برطانیہ کا دباؤ کم ہو گیا۔

اسی سال کے دوران میں اُردن کے پڑوسی عرب ممالک خصوصاً مصر میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں' ان کی وجہ سے اُردن کے لئے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ مصر میں قوم پرست جمال عبدالناصر کے برسراقتدار آنے کے بعد دوسرے عرب ملکوں کی طرح اُردن میں بھی ناصر کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو گئی۔ جمال ناصر نے ان کی مدد سے شاہ حسین کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کئی بار کوشش کی۔

۱۹۵۸ء میں جب شام اور مصر میں ''متحدہ عرب جمہوریہ'' قائم ہوئی تو شاہ حسین نے عراق کے ساتھ مل کر' جہاں ان کے چچا کی اولاد حکمران تھی' ایک نیا وفاق بنا لیا' لیکن چند ماہ بعد ۱۴ر جولائی کو عراق میں جنرل عبدالکریم قاسم کا فوجی انقلاب آ جانے سے نہ صرف یہ کہ وفاق ناکام رہ گیا' بلکہ اُردن میں بھی ایسے ہی فوجی انقلاب کا خطرہ پیدا ہو گیا' جس سے بچنے کے لئے شاہ حسین کو برطانیہ سے مدد طلب کرنی پڑی۔ اس نئے خطرے کی روک تھام کے لئے اور مصر کے صدر ناصر کے حامیوں کی طرف سے انقلاب کے خطرے سے بچنے کے لئے اُردن کو سعودی عرب کی طرف جھکنا پڑا اور دونوں ملکوں کے درمیان قریبی تعاون پیدا ہو گیا۔

۱۹۶۷ء۔ جون میں عربوں اور اسرائیل کی چھ روزہ جنگ میں اسرائیل نے اُردن پر زبردست حملہ کر کے پورے یروشلم اور مغربی کنارے کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اُردن کے ہاتھ سے فلسطین کا سارا (مقبوضہ) علاقہ نکل گیا اور اب اُردن صرف ان علاقوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۴۸ء سے پہلے شرقِ اُردن میں شامل تھے۔

فلسطینی مہاجرین کا سیلاب

۱۹۶۷ء کی جنگ میں عربوں کی ناکامی کے سبب اُردن کے لئے زبردست مسائل پیدا ہو گئے' جن میں مالی مسائل کے علاوہ فلسطینی مہاجرین کا مسئلہ سب سے زیادہ سنگین اور تشویش ناک ہو گیا۔ اُردن میں مہاجرین کے کیمپ فلسطینی چھاپہ ماروں کے مرکز بن گئے' جہاں سے وہ اسرائیل پر حملے کرنے لگے۔ مصر اور شام کی حکومتیں بھی فلسطینی چھاپہ ماروں کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں' کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اسرائیل اگر اُن کے خلاف جوابی کارروائی کرے گا تو مصر اور شام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا' صرف اُردن ہی اسرائیل کی زد میں آئے گا۔ شاہ حسین کی حکومت کا تختہ الٹنا مصر و شام کی بہت بڑی آرزو تھی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ کئی سال تک اُردن کی مغربی سرحد میدان جنگ بنی رہی۔ ادھر سے چھاپہ مار اسرائیل پر حملہ کرتے تھے' اُدھر سے اسرائیلی بمبار طیارے اور توپ خانے اُردن میں چھاپہ ماروں کے اڈوں پر گولہ باری کرتے تھے۔

اشتراکی عناصر بھی فلسطینی مہاجرین کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور انہیں اُردن کی حکومت کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔ اشتراکی عناصر نے دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کی اور مسافر بردار طیاروں کو اغوا کرنا شروع کر دیا۔ امریکن یونیورسٹی کی طالبہ لیلیٰ خالد کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا۔ اس نے نعرہ لگایا کہ فلسطین کو آزاد کرانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پہلے شاہ حسین کی حکومت کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ جب اُردن کی حکومت نے چھاپہ ماروں کو سختی سے کنٹرول کرنا چاہا تو ان اشتراکی عناصر نے جن میں سب سے نمایاں ایک کمیونسٹ عیسائی جارج حبش تھا' فلسطینی چھاپہ ماروں کو ۱۹۷۰ء میں اُردن کی حکومت سے ٹکرا دیا اور انہوں نے شمالی اُردن میں عملاً اپنی حکومت قائم کر لی۔ صورت حال ایسی پیدا ہو گئی کہ یاسر عرفات کی تنظیم ''الفتح'' جو مصر و شام اور عراق کے اثرات سے بھی آزاد تھی اور جس پر اشتراکی عناصر کا بھی غلبہ نہیں تھا' فلسطینی چھاپہ ماروں کی مدد کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس طرح عرب ممالک اشتراکی عناصر کے جال میں پھنس گئے اور ان کی غلط اور خود غرضانہ پالیسی نے حقیقی

دشمن کا مقابلہ کرنے کی بجائے مسلمانوں کو مسلمانوں سے ٹکرا دیا۔

دریں صورت حال شاہ حسین کو سخت کارروائی کرنا پڑی۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں اُردن کی فوج نے فلسطینی گوریلوں کے تمام ٹھکانوں کا صفایا کر دیا۔ شام' الجزائر اور لیبیا نے اُردن سے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے۔ اُردن کے وزیر اعظم واصفی الاتاج کو قاہرہ میں قتل کر دیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء میں عرب اسرائیل جنگ میں اُردن نے اپنے دستے شام کے محاذ پر بھیجے۔ اس جنگ کے بعد مصر اور شام نے اُردن سے متعلق اپنی پالیسی بدل دی اور یہ دونوں ملک بتدریج اُردن کے قریب آ گئے۔ اس پالیسی کا ایک مفید نتیجہ یہ نکلا کہ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں جب رباط میں عرب ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس ہوئی تو شاہ حسین نے تنظیم آزادی فلسطین (پی ایل او) کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ وہ فلسطین کے جس حصے کو بھی آزاد کرائے گی۔ اس پر اسے حکومت کا بھی حق حاصل ہو گا۔ اگلے ماہ شاہ حسین نے اُردن کے آئین میں ترمیم کر دی' تاکہ دریائے اُردن کے مغرب میں ''آزاد فلسطین'' کے قیام کے لئے راہ ہموار کی جائے۔ اس ترمیم کے بعد اُردن کی مجلس قانون ساز میں فلسطینیوں کی نمائندگی ختم کر دی گئی۔

۱۹۷۹ء۔ کیمپ ڈیوڈ میں اسرائیل کے وزیر اعظم اور مصر کے صدر انور السادات کے مابین مذاکرات کے بعد جو اَمن معاہدہ ہونے والا تھا' شاہ حسین اور یاسر عرفات نے اس معاہدے کے خلاف مشترکہ بیان دیا۔ امریکہ نے اُردن پر سخت دباؤ ڈالا کہ وہ عربوں کی صف سے باہر نکل آئے' لیکن اُردن نے عربوں کا ساتھ دیا اور مصر سے تعلقات منقطع کرتے ہوئے' عربوں کے مشترکہ بائیکاٹ کا ساتھ دیا۔

۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۸ء ۔ ایران اور عراق کی آٹھ سالہ جنگ میں اُردن نے عراق کی حمایت اور ایران کی مخالفت کی۔

۱۹۹۱ء۔ خلیجی جنگ کے دوران اُردن نے عراق کا ساتھ دیا' جس کی وجہ سے امریکہ نے اس کی اقتصادی امداد بند کر دی۔ جنگ کے خاتمے پر جب اُردن نے مشرقِ

وسطیٰ میں امن مذاکرات میں شرکت کی تو امریکہ سے تعلقات بحال ہو گئے۔

۱۹۹۴ء، جولائی۔ شاہ حسین اور اسرائیل کے وزیر اعظم کے مابین ایک امن معاہدہ ہوا، جس کے تحت دونوں ملکوں کی دیرینہ مخاصمت دُور کرنے کا عزم کیا گیا۔ اس معاہدے کی وجہ سے امریکہ اور سعودی عرب سے اُردن کے تعلقات خوشگوار ہو گئے۔

۱۹۹۹ء۔ ۲۳ر جنوری کو شاہ حسین نے سرطان کی علالت کے پیش نظر، غیر متوقع طور پر اپنے بھائی شہزادہ حسن کو تخت کی جانشینی اور ولی عہدی سے معزول کر دیا جو گزشتہ ۳۴ سال سے تخت کے وارث اور ولی عہد تھے، اور ان کی جگہ اپنے بڑے بیٹے عبداللہ کو نیا ولی عہد مقرر کر دیا۔ اُس وقت عبداللہ ثانی کی عمر ۳۷ سال تھی۔

آئندہ سال ۷ فروری ۲۰۰۰ء کو شاہ حسین بن طلال نے مسلسل ۴۸ سال بادشاہت کرنے کے بعد وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد عبداللہ بن حسین نے زمامِ اقتدار سنبھالی۔ شاہ عبداللہ ثانی نے سب سے پہلے قدامت پسند وزیر اعظم عبدالرؤف کو برطرف کیا اور اس کی جگہ موجودہ وزیر اعظم علی ابوالراغب کو مقرر کیا، جو سیاسی امور میں آزاد خیال سمجھے جاتے ہیں۔ وہ اُردن کی بہت بڑی کاروباری شخصیت بھی ہیں۔

۲۰۰۲ء کے وسط میں جب امریکہ اور عراق کی مخاصمت عروج پر پہنچ گئی تو اُردن مخمصے میں پڑ گیا۔ عراق اس کا دایاں پڑوسی تھا اور اُردن کی تیل کی ضروریات زیادہ تر عراق ہی پوری کرتا تھا۔ عراق اور امریکہ کی جنگ کا مطلب اُردن میں سیاسی عدم استحکام اور معاشی عدمِ توازن تھا۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ اُردن میں لاکھوں فلسطینی مہاجرین عراق کے حامی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُردن جیسی چھوٹی مملکت دنیا کی واحد سپر طاقت کو بھی ناراض نہیں کر سکتی تھی جو اُردن کو سب سے زیادہ مالی امداد دینے والا ملک بھی ہے۔ اس لئے اُردن نے ''غیر جانب دار'' رہنے کی پوری کوشش کی۔

اسلامی، تحریکی جماعتیں

بادشاہت میں جمہوریت کہاں رہ سکتی ہے۔ ہوگی تو محدود ہوگی، اور اس کی حدود

بھی بادشاہ ہی معین کرے گا۔ یہی کیفیت اُردن کی رہی ہے۔ کبھی سیاسی جماعتیں بنانے کی اجازت دے دی جاتی ہے' کبھی سیاسی جماعتوں کو ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ منظم اسلام پسند جماعتوں میں ایک گروہ اُن جماعتوں کا ہے جو سیاست میں حصہ لینا چاہتی ہیں۔ دوسرا گروہ اُن جماعتوں کا ہے جو صرف احیائے اسلام اور تجدید دین پر زور دیتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں میں سے بھی بعض کو قانونی حیثیت حاصل ہے اور بعض کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ''الاخوان المسلمون'' کی رجسٹریشن ایک فلاحی' مذہبی' مخیر تنظیم کی حیثیت سے کی گئی ہے اور اسے اپنی سرگرمیوں کی کھلی چھٹی ہے' کیونکہ وہ بادشاہ کی وفادار اور ہاشمی خاندان کی حکومت کی حامی ہے۔ اس کے مقابلے میں حزب التحریر الاسلامی' حماس' جماعت الجہاد الاسلامی' جیش محمد اور حرکت شباب الانفیر الاسلامی کی رجسٹریشن نہیں کی گئی' اس لئے اُن کے قائم رہنے اور سرگرم رہنے کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے۔ اِن جماعتوں نے' حماس کے سوا' تمام عرب حکومتوں کو بدلنے اور ان کی جگہ مخلصانہ اسلامی حکومتیں لانے کا دعویٰ اور مطالبہ کیا ہے۔ دوسرے گروہ میں وہ منظم اسلامی تحریکات شامل ہیں جو صرف دینی شعائر کے قیام اور سچی شریعت کی بالادستی کے لئے کوشاں ہیں' ان میں جماعت تبلیغ اور جماعت سلفیہ سرفہرست ہیں۔

تاریخی مقامات وزیارات

عقبہ: اُردن کی واحد بندرگاہ جو خلیج عقبہ کے ساحل پر واقع ہے' اس کا فاصلہ سرحد سے دو میل اور الحقل سے سات آٹھ میل ہے۔ الحقل اُردن اور سعودی عرب کی سرحد پر ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے۔ عقبہ کا قدیم نام ''ایلہ'' ہے۔ جن دنوں رسولِ کریم ﷺ تبوک میں قیام پذیر تھے' یہاں کا حاکم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے جزیہ دے کر اپنے آپ کو اسلامی حکومت میں دینا قبول کرلیا۔ ایلہ ہی وہ جگہ ہے جہاں اہل السبت مچھلیاں پکڑا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ ممانعت کے باوجود ہفتے

کے روز مچھلی کا شکار کرنے کے لئے سمندر کے کنارے زمین میں گڑھے کھود لیتے تھے تاکہ بظاہر تو ہفتہ کے روز شکار نہ کریں' لیکن گڑھوں میں مچھلیاں خوب جمع کر لیں اور اگلے روز انہیں پکڑ لیں (اصحاب السبت کا سورۃ الاعراف' آیت ۱۶۳ اور بعض دوسری سورتوں میں ذکر آیا ہے۔) عقبہ کے بالمقابل مغرب کی طرف ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر اسرائیل کی بندرگاہ ایلات صاف نظر آتی ہے۔ اب تو عقبہ اُردن میں عمان اور بیت المقدس کے بعد غالباً سب سے بڑا شہر بن چکا ہے اور اس کی حیثیت وہی ہوگئی ہے جو عراق میں بصرہ کی ہے۔

مَعان: عقبہ سے ۱۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر اور عمان کے جنوب میں ۴۵ میل کے فاصلے پر ایک متوسط درجے کا شہر ہے۔ تاریخ اسلام میں اس کی اہمیت اس راستے کی وجہ سے ہے جو سیدھا تبوک کو جاتا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شام جانے کے لئے اسی راستے سے تشریف لاتے تھے۔

وادیٔ مُوسیٰؑ: یہ وادی مَعان سے صرف ۲۵ کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ یہ ایک بہت ہی سرسبز و شاداب اور خوبصورت وادی ہے' جس میں ہر طرف پہاڑوں کی چوٹیوں اور ڈھلانوں پر رنگ برنگ کے پھول اور درخت نظر آتے ہیں۔ اس کے سجانے میں وہاں کے رہنے والوں کی محنت اور جفاکشی کا بھی بڑا دخل ہے۔ یہ ساری وادی ایک چشمے سے سیراب ہوتی ہے جس کو عینِ موسیٰ کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے آخری زمانے میں اسی مقام پر آ کر ٹھہرے تھے۔ یہیں حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال ہوا تھا اور اسی وادی کے قریب ایک پہاڑ پر انہیں دفن کیا گیا تھا۔ تورات میں اس پہاڑ کا نام ''جبل ہور'' بیان ہوا ہے اور اب اسے ''جبلِ ہارون'' کہتے ہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام کا مزار موجود ہے اور وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔

بطرا: اسی وادیٔ موسیٰ میں بطرا (Patra) کا مشہور تاریخی مقام بھی واقع ہے' جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دو سو سال قبل نبطیوں (جو عرب تھے) نے اپنا دارالحکومت

قائم کرلیا تھا۔ گزشتہ صدی کے وسط میں یہ دریافت ہوا اور اس کی کھدائی کی گئی۔ یہ قدیم شہر تین چار میل لمبا ہے اور چوڑائی بعض جگہوں پر دس پندرہ گز ہو جاتی ہے' بلکہ بعض جگہوں پر تو دو تین فٹ رہ جاتی ہے۔ لیکن سفید اور کہیں سرخ پہاڑوں کو تراش کر نہایت عمدہ مکان بنائے گئے ہیں' اور بعض مکان اتنے شاندار ہیں کہ دیکھنے پر بھی یقین نہیں آتا کہ یہ آج سے سوا دو ہزار سال قبل کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں نبطیوں کا دربار لگا کرتا تھا' اور ایک دوسری جگہ نہایت شاندار قسم کا ہال بنا ہوا ہے' جس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے کئی کمرے ہیں۔ اس کے سامنے سرخ رنگ کے بلند ستون اس عمدگی سے تراشے گئے ہیں کہ خوبصورتی اور صفائی میں موجودہ زمانے کی کسی شاندار عمارت سے کم نہیں ہیں۔

اللسان: بحر مردار کے مشرقی ساحل پر ایک مقام ہے' جس کے قریب جنوب کی طرف بحر مردار کا وہ حصہ واقع ہے جہاں سدوم اور قوم لوط کے دوسرے شہر غرق ہوئے تھے' اسی لئے بحرِ مُردار کے اس حصے کو بحرِ لُوط کہا جاتا ہے۔ اس علاقے پر کسی زبردست عذاب نے زمین کو جگہ جگہ سے شق کر دیا ہے اور جگہ جگہ سے زمین دھنس گئی ہے۔ اب کچھ عرصے سے اُردن کی حکومت سدوم کے شہر اور اُن کے آثار تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

مُوتہ: یہ پہاڑی علاقہ ہے اور ایک بہت ہی بلند سطح مرتفع پر واقع ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا قصبہ موتہ کے نام سے موجود ہے۔ اس قصبے سے متصل ایک وسیع میدان ہے جس میں رومیوں اور صحابہ کرام ﷺ کے درمیان مشہور جنگ ہوئی تھی۔ اس میدان کے ایک حصے کا نام الشہداء یا مشہد ہے۔ جنگ موتہ میں شہید ہونے والے بہت سے صحابہ کرامؓ یہاں مدفون ہیں۔ غزوۂ موتہ کے موقع پر صحابہ کرامؓ کی لشکر گاہ اس جگہ تھی جہاں قریب ہی المزار کا شہر آباد ہے۔ یہاں حضرت جعفر طیار' حضرت عبداللہ بن رواحہ' حضرت زید بن حارث اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قبریں موجود ہیں۔

عمان : یہ اُردن کا دار الحکومت' ملک کا سب سے بڑا' اہم تجارتی و ثقافتی مرکز ہے۔ یہ بحیرۂ مردار کے شمال مشرق میں' وادیٔ زرقا میں آباد ہے۔ زمانۂ قبل از تاریخ کا مشہور شہر رباہ یا رباث امون' جس کا ذکر بائبل میں آیا ہے' اسی جگہ آباد تھا۔ یہ شہر گیارھویں صدی قبل مسیح میں حضرت داؤد علیہ السلام نے فتح کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں اس نے دوبارہ آزادی حاصل کر لی۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں یہ اشوریہ کے زیر نگین آیا۔ ۳۰ قبل مسیح میں اسے رومیوں نے از سر نو تعمیر کرایا۔ ۶۳۶ء میں اس پر اسلامی پرچم لہرایا۔ ۱۹۲۱ء میں اُردن کا دار الحکومت بنا۔

وادیٔ شعیبؑ : یہ ایک سرسبز و شاداب وادی ہے اور چشموں کا پانی اس میں نہر کی طرح بہتا ہے۔ اسی وادی میں ایک اونچے مقام پر حضرت شعیب علیہ السلام کا مقبرہ ہے۔ عام روایت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب آنے کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام یہیں تشریف لے آئے تھے۔ یہ چیز کچھ زیادہ بعید از قیاس بھی نہیں ہے' کیونکہ مدین جس علاقے کا نام ہے' وہ بہت وسیع علاقہ تھا اور موجودہ اُردن سے بالکل متصل واقع تھا' بلکہ اس کا شمالی حصہ تو اس وقت بھی اُردن کی مملکت میں شامل ہے۔ خود عقبہ بھی اس کا ایک اہم مرکزی مقام تھا۔

اریحا : یہ ایک بہت ہی قدیم شہر ہے جو دریائے اُردن کے مغربی کنارے (ضفہ غربیہ) پر واقع ہے۔ اس وقت اسرائیل کے قبضے میں ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں یہ اسی طرح آباد و شاداب تھا۔ ہر طرف پھلوں کے باغ نظر آتے ہیں۔

القُدس : یروشلم کا عربی نام ہے۔ اسے بیت المقدس بھی کہا جاتا ہے۔ امت مسلمہ کا قبلۂ اوّل ہے۔ ۱۹۴۹ء میں فلسطین کی تقسیم کے وقت شہر کا نصف حصہ اُردن میں اور نصف اسرائیل میں شامل کر دیا گیا تھا۔ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں پورے شہر پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا۔ یاسر عرفات کا مطالبہ ہے کہ ''آزاد فلسطین'' کے قیام کی پہلی شرط یہ ہے کہ پورا القدس (یروشلم) اس ریاست کا دار الحکومت ہوگا' لیکن اسرائیل کو یہ کسی قیمت پر منظور نہیں۔

بیت اللحم: القدس کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر ایک اہم تاریخی مقام ہے جہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ اب اُس مقام پر جہاں آپؑ کی پیدائش ہوئی تھی، ایک بہت عظیم الشان گرجا بنا ہوا ہے جسے ''کنیسۃ المہد'' کہتے ہیں اور دنیا کے ہر حصے سے عیسائی اس کی زیارت کے لئے اس طرح آتے ہیں جس طرح مسلمان حج و زیارت کے لئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جاتے ہیں۔ اس گرجا میں وہ غار موجود ہے جس کے اندر حضرت عیسٰیؑ کی ولادت ہوئی تھی۔ اس غار سے بالکل متصل ایک کونے میں ایک پتھر نصب ہے جس میں ایک گول سوراخ ہے۔ اس جگہ وہ کھجور کا درخت تھا جس کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے کہ فرشتے نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ اس کھجور کے تنے کو ہلاؤ تو تمہارے اوپر پکی کھجوریں گریں گی۔ جس جگہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش بتائی جاتی ہے وہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام کا ایک بچے کی شکل میں بت بنا کر رکھا ہوا ہے اور اس کے قریب ایک پنگھوڑا بنا کر ایک بچے کا بت اس میں رکھ دیا گیا ہے۔

الخلیل: القدس سے اس شہر کا فاصلہ بیس میل کے قریب ہے۔ اس شہر کا قدیم نام حبرون ہے۔ چار ہزار سال پہلے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں تشریف لائے تھے تو اس وقت بھی یہ شہر آباد تھا۔ یہ دنیا کے اُن چند قدیم ترین شہروں میں سے ہے جو ہزاروں برس سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ یہاں بعض انبیائے کرامؑ کی قبریں ہیں جو بالکل ثابت ہیں۔ اصل قبریں ایک غار کے اندر ہیں، جس میں جانے کے تین راستے ہیں اور تینوں بند ہیں۔ غار کے اوپر ایک بہت عالی شان عمارت بنی ہوئی ہے جس کے ایک حصے میں مسجد بالکل غار کے اوپر واقع ہے۔ اس غار میں حضرت ابراہیم، حضرت سارہ، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام کی قبریں ہیں۔ اصل قبریں تو غار کے اندر ہیں، لیکن اوپر مسجد کے اندر قبروں ہی کی شکل میں ان کے نشانات بنے ہوئے ہیں۔

مقام حضرت لوط علیہ السلام: یہ مقام الخلیل سے جنوب مشرق کی طرف بحرِ لوط کے قریب واقع ہے۔ یہاں ایک پہاڑی پر حضرت لوط علیہ السلام کی قبر ہے اور اس پر مسجد بنی ہوئی ہے۔ اب اس مقام کو نبی نعیم کہا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ قومِ لوط کی تباہی کے

بعد حضرت ممدوح یہیں چلے آئے تھے۔

اصحابِ کہف کا غار: یہ غار عمان کے جنوب مشرق میں تقریباً سات میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اس کی قریبی بستی کا نام ''رقیب'' ہے جس کا تلفظ اہل اُردن اپنی عامی زبان میں ''رجیب'' کرتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ یہ لفظ دراصل رقیم (اصحاب الکھف والرقیم) سے بگڑا ہوا ہے۔ اس غار کے اندر اتنی تاریکی ہے کہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

مزاراتِ صحابہ ﷺ: شہر اربد اُردن اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر القدس جانے والی سڑک پر' حضرت معاذ بن جبل ﷺ کا مزار ہے۔ وہاں سے ایک سڑک دریائے اُردن کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ القدس کو جاتی ہے۔ مغربی کنارے پر اسرائیل کا قبضہ ہے۔ مشرقی کنارے پر کئی کئی میل کے فاصلے پر حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح' حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ اور حضرت ضرارؓ بن ازدر کے مزارات ہیں۔

میدانِ یرموک: یہ مقام اربد سے چند میل کے فاصلے پر شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ اصل میدان تو شام کی سرحد پر واقع ہے' لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ اُردن کی سرحد پر ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر کیا جا سکتا ہے۔ اس جگہ دریائے یرموک اُردنی پہاڑی اور میدانِ یرموک کے درمیان حائل ہے۔ اس میدان میں ایک طرف حضرت خالد بن ولید' حضرت ابوعبیدہ بن الجراح اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی قیادت میں چالیس ہزار مسلمانوں کا لشکر تھا' جس کے مقابلے میں دریائے یرموک کے کنارے دو لاکھ کے قریب رومیوں کا لشکر تھا۔ یہی وہ میدان ہے کہ حضرت خالد بن ولید ﷺ کی قیادت میں رومیوں سے جنگ جاری تھی کہ انہیں حضرت عمر فاروق ﷺ کی جانب سے معزولی اور ان کی جگہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح ﷺ کی تقرری کا خط ملا تھا۔ اسی میدان میں اسلامی لشکر کو وہ فتح نصیب ہوئی تھی' جس نے شام میں اسلامی فتوحات کا دروازہ کھول دیا اور جس کی خبر موصول ہونے پر رومی شہنشاہ ہرقل نے حمص میں اپنا یہ

مشہور تاریخی جملہ زبان سے نکالا تھا: ''اے بلادِ شام! تجھ کو الوداعی سلام'' اور یہی وہ دریائے یرموک ہے، جس میں رومیوں کے ایک لاکھ بیس ہزار پیادہ سپاہی گر کر ہلاک ہوئے تھے۔

مآخذ

☆ اردو دائرہ معارف اسلامی، پنجاب یونیورسٹی، جلد دوم
☆ انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم (جلد اول)، مولانا غلام رسول مہر
☆ سفرنامہ ارض القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
☆ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ثروت صولت
☆ تاریخ اسلام، نشتر جالندھری
☆ ''ندائے خلافت کا فلسطین نمبر، سید قاسم محمود
☆ اسلامی المانک، سید قاسم محمود

☆*Muslim World Today* ..... *S. Amjad Ali*
☆*New Encyclopedia* ..... *Volume 22*
☆*Encylopedia of Modern Islamic World* ..... *Oxford*
☆*Time Almanac 2003* ..... *Information Please*
☆*Dictionary of Twentieth Century* ..... *Penguin*

آپ دنیا کے کسی گوشہ میں یعنی عالمی گاؤں (GLOBAL VILLAGE) کے کسی بھی محلے میں ہوں

ویب سائٹ **www.tanzeem.org** کے ذریعے

قرآن مجید کا مکمل ترجمہ، ہر سورۃ کا درس اور دیگر اہم موضوعات پر خطابات کے علاوہ

جامع مسجد دارالسلام باغ جناح کا **خطابِ جمعہ**

امیر تنظیم اسلامی جناب **حافظ عاکف سعید** اور

بانی و تنظیم اسلامی محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** کی آواز میں سنئے اور سنایئے